

چاند نگر

ابن انشا



چاند نگر

الجزء ٢

ابنِ انشا

چاند نگر

لاہور اکیڈمی

۲۰۵- سرکلر روڈ - لاہور

طبع اوّل ۱۹۵۵ء

طبع دوم ۱۹۶۸ء

طبع سوم ۱۹۷۶ء

طبع چہارم ۱۹۷۸ء

طبع پنجم ۱۹۷۸ء

قیمت -/۱۵ روپے

ناشرین

لاہور اکیڈمی ۔ ۲۰۵ سرکلر روڈ، لاہور

مطبع : جی۔ایف پرنٹنگ پریس لاہور

ترتیب

مختصر نظمیں

ریختہ

(غزلیات)

طویل نظمیں

دیباچہ طبع اوّل

ایڈ گر ایلن پو کی ایک نظم ہے — ایلڈوریڈو یعنی شہرِ تمنا — قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک بہادر جی دار نائٹ اوچھا بنا، دھوپ اور سائے سے بے پروا ایلڈوریڈو کی تلاش میں مستانہ گیت گاتا گھوڑا اڑاتا چلا جا رہا ہے لیکن برسوں گزر گئے۔ زندگی کی شام آگئی۔ اسے رُوئے زمین پر کوئی خطہ ایسا نہ ملا جو اس کے خوابوں کے شہر کا مثیل ہوتا۔ آخر جب اس کی تاب و تواں جواب دینے کو تھی اسے ایک بڈھا پھوس زائر ملا، جو سفر کی صعوبتوں سے گھل کر سائے کے سمان رہ گیا تھا۔ اس پیرِ فرتوت نے بھوؤں کی جھالر ہٹاتے ہوئے کہا :— "اگر تمہیں اس شہرِ جادو کی تلاش ہے تو چاند کی پہاڑیوں کے اُدھر سایوں کی وادئ طویل میں قدم بڑھاتے گھوڑا دوڑائے آگے ہی آگے بڑھتے چلو ......"

معلوم نہیں اس سورما نائٹ کو وہ شہرِ تمنا ملا کہ نہیں لیکن سفر جاری رکھنے اور گھوڑا آگے بڑھانے کا بہانہ ضرور مل گیا۔ شاعر کو بھی ذہنی طور پر سند باد جہازی یا یولیسس ہونا چاہیئے یعنی اس کے سامنے ایک نہ ایک ایلڈوریڈو — ایک نہ ایک چاند نگر کا ہونا ضروری ہے۔ چاند کی پہاڑیوں کے حوالے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دونو شہر، یہ دونو منزلیں کہیں ایک نہ ہوں۔ چاند ہمیشہ دور دراز کی محبوب اور سجیلی لیکن کٹھن اور ناقابل

حصولِ منزلوں کا سمبل رہا ہے جو کوہِ ندا کی طرح مسافروں کو بلاتی تو ہیں لیکن واپس نہیں بھیجتیں۔ سمجھ دار لوگ کبھی ان منازلِ موہوم کا رُخ نہیں کرتے بلکہ بے چین دنوں اور بے خواب راتوں کے وجود سے بے خبر لطیفوں والے مصوّر پرچے پڑھتے خوشحال و چونچال زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن سنا ہے اگر جادو کے موہوم شہروں کی طلب میں بولاں رہنے والے دیوانے نہ ہوتے تو یہ زندگی بڑی ہی سپاٹ اور بے رنگ ہوتی۔ اتنی گمبھیر اور دلنواز کبھی نہ ہوتی — اب یہ اپنی اپنی طبیعت پر منحصر ہے کہ گوشۂ عافیت پسند کرتی ہے یا اس ناٹث کی راہ اختیار کرتی ہے۔

میں افتادِ طبع کے اعتبار سے بے شک رومانی بلکہ الف لیلوی واقع ہوا ہوں لیکن رہتا ایک ایسی دنیا میں ہوں جو شہرزاد کی دنیا سے مختلف ہے۔ میری طویل نظمیں زیادہ تر گردوپیش کی سنگین حقیقتوں سے میرے الف لیلوی مزاج کے تصادم کی پیداوار ہیں۔ لیکن میں نے عشق اور غیرِ عشق کے محاذوں پر الگ الگ لڑنا پسند کیا ہے میرے ہاں "آمری جاں انقلاب" کا آمیزہ نہیں نہ مجھے آنچل کو پرچم بنانے کی ادا پسند ہے۔ میرے ہاں آپ کو لذتِ عشق، بہجتِ عشق اور ذلتِ عشق کے ذاتی واردات بھی ملیں گے۔ دل کی ویرانی اور وارستگی کی حکایتیں بھی کہ 'اداس رات کے آنگن میں' 'پچھلے پہر کے سناٹے میں' — 'کاتک کا چاند' میں اور 'اے متوالو ناقوں والو' میں بکھری ہوتی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ 'امن کا آخری دن'۔ افتاد اور مضافات وغیرہ بھی جن میں واضح سیاسی شعور جھلکتا ہے اگر ان نظموں میں بھی کہ ترقی پسند ہیں بعض جگہ آپ کو تذبذب یا تشائم کی کیفیت ملتی ہے تو یہ میری ہمتوں کی پستی کی ترجمان ہے اسے میں نے اس لیے خارج نہیں رکھا کہ میری شاعری ذاتی شاعری رہے، تبلیغی نہ بنے۔

گرآم کی چڑیلوں کی کہانیوں میں ایک ضدی بڈھا سر ہلا کر کہتا ہے کہ انسانیت کا دھیلہ بھر جوہر میرے نزدیک دنیا بھر کی دولت پہ بھاری ہے۔ میری کتنی ہی نظمیں کہ مجھے عزیز ہیں اسی دھیلہ بھر انسانیت کے متعلق ہیں۔ دکھ اور آسودگی۔ احتیاج اور فراغ، جنگ اور امن زندگی کے بنیادی مسائل ہیں۔ جو شخص ان سے بے اعتنائی برتتا ہے وہ اپنے زمین زاد بھائیوں سے مخلص نہیں ہو سکتا۔ پھر آج کے زمانے میں ذہنی یا جسمی بن باس ممکن بھی نہیں۔ کسی پہاڑ کی کوئی گپھا ایسی نہیں جس تک زہر ملی گیس یا تابناک راکھ نہ پہنچ سکتی ہو۔ کوئی برندابن یا تپوبن ایسا نہیں جس کے بطن میں فوجی طیاروں کا اڈہ نہ ہو۔ ہمیں زندہ حقیقتوں سے پیچھا چھڑانے کی بجائے ان سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ انھی میں ایک یہ کہ سوشلزم کا دور واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہے۔ دھاندلی، بغاوت اور جنگ سب نسخے پرانے ہیں۔ لوگ انہیں آزمائیں گے۔ نفسیاتی مغالطے بھی دامنگیر ہوں گے۔ لیکن کسی نظام کی ناکامی کا معیار یہ نہیں کہ اس سے کسی ڈھلمل انٹلکچول کی ذہنی تشفی ہو۔ دیکھنا یہ ہے آیا اس سے لاکھوں کروڑوں سادھارن اور غیر انٹلکچول انسانوں کی زندگی میں مسرت اور شادمانی کا گزر ہوا کہ نہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں مجھ میں فنکارانہ احساس نہ جاگا تھا۔ ایک عامی کے احساس اور فنکارانہ احساس میں فرق ہے۔ ایک عامی کے طور پہ دس پندرہ یا کہ سولہ کے سن کے باوجود مسائل کو کچھ کچھ سمجھنا اور بات ہے اور جذبے میں وہ تیکھاپن اور رچاؤ ہونا اور کہ شاعری میں ڈھل سکے۔ کوریا کی لڑائی نے البتہ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کی بازگشت میری اب تک کی نظموں میں سنائی دے گی۔ میرے لیے جنگ

کسی اخبار کی موٹی سرخی نہیں بلکہ آگ اور تباہی کا نام ہے اور سپاہی محض وردی بندوق اور تمغہ نہیں بلکہ کسی بیٹے بھائی یا پیارے کا جسم اور رُوپ ہے۔

گ — گبرو ہے کہ بائیس بہاروں میں پلے

ل — لاشہ ہے کہ دو روز کے اندر سڑ جائے

سارتر نے فرانس پر نازی قبضے کے دنوں میں لکھا تھا کہ فرانس میں کمیون کی شکست کے بعد لوگوں پر جو ظلم ڈھائے گئے۔ ان کے لیے میں فلابیئر اور گانکور کو قصور وار ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ انھوں نے اس کو روکنے کے لیے ایک لفظ بھی تو نہیں لکھا! اگر یہ ان کا کام نہیں تھا تو کیا ژاں کیلا کا معاملہ والٹیر کے فرائض میں داخل تھا؟ کیا ڈرفس کی وکالت زولا پر فرض تھی۔ کیا کانگو کے مستبد حاکموں کے خلاف آواز بلند کرنے کی ذمہ داری آندرے ژید پر عاید ہوتی تھی —— ان میں سے ہر شخص نے اپنے مخصوص حالات میں ایک بار رُک کر یہ سوچا کہ بحیثیت مصنف کے میری کیا ذمہ داری ہے؟ ہمارے ملک پر جرمنی کے قبضے نے ہمیں ہماری ذمہ داری سمجھا دی ہے

کیا ہمارے دور کی کوئی ذمہ داری نہیں؟

میں آدرشس واد کو ترقی یا ترقی پسندی کے منافی نہیں سمجھتا۔ ہاں آدرش آدرش میں فرق ہے۔ ایک منزل پر آئیڈیلزم اور رومانیت — حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کی حریف نہیں بلکہ حلیف بن جاتی ہیں۔ رومانی انقلابیت غلط لیکن انقلابی رومانیت صحیح۔ میری غیر عشقیہ نظموں کو اسی محک پر پرکھیے۔

اب کچھ متفرق باتیں میری شاعری کے متعلق سنتے جائیے۔ میری لکھنے کی رفتار

خاصی سُست ہے: "بغداد کی ایک رات" کی تکمیل میں مجھے چار سال لگے۔ بعض نظمیں میں چھ سات سال سے لکھ رہا ہوں۔ مہینوں خالی گزر جاتے ہیں۔ ہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند دن کے وقفے میں بہت کچھ لکھ لوں۔ "شنگھائی" تین راتوں میں لکھی گئی۔ 'امن کا آخری دن'۔ 'سرائے'، 'کوچے کی لڑائی اور کوریا کی خبریں' جو سب کی سب طویل نظمیں ہیں آٹھ دس دن کے ایک وقفے میں لکھی گئیں۔ میں نے شعر کہنا تو دس گیارہ برس کی عمر میں شروع کر دیا تھا۔ لیکن پہلی نظم اشاعت کے لیے ۱۹۴۴ء میں ایک ادبی پرچے میں بھیجی۔ "قیام پاکستان" تک کچھ نہ کچھ لکھتا اور چھپتا رہا۔ لیکن سنجیدگی سے شاعری کا آغاز ۱۹۴۹ء سے جاننا چاہیئے جب کہ 'بغداد کی ایک رات' چھپی' اور لوگوں کی توجہ کی طالب ہوئی۔ اسلوب کے تجربے آپ کو زیادہ تر میری مختصر نظموں میں ملیں گے۔ 'امن کا آخری دن' میں میں نے پنجابی کی صنف 'سی حرفی' کو آزمایا ہے۔ ایک زمانے میں آڈن سے انسیت تھی جس سے میں نے یہ سیکھا کہ کوئی لفظ اور کوئی ترکیب غیر شاعرانہ نہیں۔ اسے اعتماد کے ساتھ استعمال کرو۔ میرے ہندی کے تھوڑے سے مطالعے نے بھی مجھے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ مجھے رواں دواں بحریں زیادہ مرعوب ہیں۔ غزلوں میں بھی ان کا انتخاب میں نے میر کی تبعت کے خیال سے نہیں (میر پسندی اور میر سے مزاجی اشتراک اپنی جگہ) بلکہ اپنی آسانی کے لیے کیا ہے۔ محض تقلید میر منظور ہوتی تو یہ بحریں میری غزلوں تک محدود رہ جاتیں' نظموں میں نہ بار پاتیں۔

میری نظموں کا جہان الگ ہے۔ ان کا سماں شام اور رات کا ہے — یہ دراصل اس زندگی کے خاکے ہیں جو میں نے ان اٹھائیس برس میں بسر کی ہے۔

گرجا کا گھڑیال جو دو بجاتا ہے۔ گاڑی کی سیٹی جو گونج اٹھتی ہے۔ ریل کی پلیا بھی کہ مضافات میں نظر آتی ہے اور چاند ــــ آبادیوں اور ویرانوں کا چاند ــــ یہ سب ماضی کی کھونٹیاں ہیں جن پر میں نے یادوں کے پیراہن ٹکا رکھے ہیں۔ اب آپ میرا ساتھ چھوڑ کر اس چاند نگر کی سیر کیجئے اور میں لے تلانجلی دے کر کسی نئے سفر پر نکلوں گا۔ نہ مجھے اپنا حسن کا ایلڈوریڈو ملا ہے نہ زندگی کا شہرِ تمنّا ــــ میری منزل چاند کی پہاڑیوں کے اُدھر سایوں کی وادیٔ طویل میں ہے اس سے واپسی ہوئی تو جو کچھ دامن میں ہوگا ــــ کلیاں، کانٹے یا غبار۔ وہ پیش کردوں گا۔

۱۵/ اپریل ۱۹۵۵ ابنِ انشا

طبع دوم

یہ چاند نگر کی دوسری جھلکی ہے۔ اس بیچ میں کتنا ہی پانی پلوں کے نیچے سے بہہ گیا۔ بلکہ کتنے ہی پلوں کو بہالے گیا۔ چاند جو ناقابلِ حصول منزلوں کا سمبل تھا، انسانی کلوخ اندازی کی زد میں آگیا۔ اعتقاد کے کعبے اجڑ گئے اور سوچ کی نہج پلٹ گئی۔ سفید اور سیاہ ایک دوسرے میں گھل مل کر رہ گئے۔ کچھ زمانہ بدل گیا۔ کچھ شاعر بدل گیا۔ طبع دوم کے وقت بہت کچھ۔ کہنے کو جی چاہا لیکن پھر آج کی پختگی کے مقابلے میں اس دور کی تازگی زیادہ عزیز ہوئی ــ عشق کرنا اور ناکام رہنا بہتر ہے عشق

نہ کرنے سے —— لہٰذا یہ پرانے موسموں کی خوشبو جیسی تھی ویسے ہی پیش ہے۔ دیباچے کی تلخیص کر دی کہ طولِ کلام سے جی گھبراتا ہے۔

اس کتاب کو نایاب ہوتے بہت برس ہوتے۔ دوبارہ کتابت ہوئی اور گم ہو گئی۔ پلیٹیں مشین پر چڑھیں اور اُتر آئیں۔ آج پھر اُسے سپردِ مطبع اور سپردِ خدا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ نئے مجموعے کو بھی۔

۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۸ء　　　ابنِ انشا

طبعِ سوم

یہ طبع سوم اشارہ ہے شاعر کے شاعری کی طرف واپسی کا۔ نئے مجموعے کا وعدہ بھی آٹھ سال بعد آج پورا ہو رہا ہے۔ اس موقع پر کوئی عذر کرنا عذرِ گناہ ہوگا۔ یوں سمجھئے صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آرہا ہے۔

اس مجموعے میں ایک نظم تو ایسی ہے کہ طبع اوّل میں تھی، طبع دوم میں نہ تھی۔ "اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے"۔ دو نظمیں اور ہیں "کوجے کی لڑائی" اور "کوریا کی خبریں"۔ یہ لکھی تو اُس زمانے میں گئی تھیں، ۱۹۵۱ء-۱۹۵۲ء میں، اور رسالوں میں چھپیں بھی۔ لیکن مجموعے میں شامل نہ کی گئی تھیں، کیونکہ ہمیں حسن سے بھی لگاؤ تھا، ہمیں زندگی بھی عزیز تھی۔ وہ دن ہمارے ملک میں آزادہ رووں کے لئے بڑی سختیوں کے تھے۔ طویل نظموں کے پورے حصے کا آپ ایک الگ مزاج پائیں گے جو ہمارے عنوانِ زندگی کا حاصل تھا اور ہے۔ چاند نگر، وہی پرانا چاند نگر۔

۱۱ جون ۱۹۷۶ء　　　ابنِ انشا

چاند کی تمنّائی

شہرِ دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں
چاند کے تمنّائی
بے قرار سودائی
دل گُداز تاریکی
جاں گُداز تنہائی
رُوح و جاں کو ڈستی ہے
رُوح و جاں میں بستی ہے
شہرِ دل کی گلیوں میں

تاکِ شب کی بیلوں پر
شبنمیں سر شکوں کی
بے قرار لوگوں نے
بے شمار لوگوں نے
یادگار چھوڑی ہے
اتنی بات تھوڑی ہے؟

صد ہزار باتیں تھیں
حیلۂ شکیبائی
صُورتوں کی زیبائی
قامتوں کی رعنائی
اِن سیاہ راتوں میں
ایک بھی نہ یاد آئی
جا بجا بھٹکتے ہیں
کِس کی راہ تکتے ہیں
چاند کے تمنّائی

یہ نگر کبھی پہلے
اِس قدر نہ ویراں تھا
کہنے والے کہتے ہیں
قریۂ نگاراں تھا
خیر اپنے جینے کا
یہ بھی ایک ساماں تھا

آج دل میں ویرانی
ابر بَن کے گِھر آئی
آج دل کو کیا کہیے
باوفا نہ ہرجائی
پھر بھی لوگ دیوانے
آ گئے ہیں سمجھانے
اپنی وحشتِ دل کے
بُن لئے ہیں افسانے
خوش خیال دُنیا نے

گرمیاں تو جاتی ہیں
وہ رُتیں بھی آتی ہیں
جب ملول راتوں میں
دوستوں کی باتوں میں
جی نہ چین پائے گا
اَور اُوب جائے گا
آہٹوں سے گونجے گی
شہرِ دل کی پہنائی
اور چاند راتوں میں
چاندنی کے شیدائی
ہر بہانے نکلیں گے
آزمانے نکلیں گے
آرزو کی گیرائی
ڈھونڈنے کو رُسوائی

سرد سرد راتوں کو
زرد چاند بخشے گا
بے حساب تنہائی
بے حجاب تنہائی
شہرِ دل کی گلیوں میں

۱۹۵۴ء

اے متوالو! ناقوں والو!!

اے متوالو ناقوں والو دیتے ہو کچھ اُس کا پتا
نجد کے اندر مجنوں نامی ایک ہمارا بھائی تھا
آخر اُس پر کیا کچھ بیتی، جانو تو احوال کہو
موت ملی یا لیلےٰ پائی؛ دیوانے کا مآل کہو
عقل کی باتیں کہنے والے دوستوں نے اُسے سمجھایا
اُس کو تو لیکن چُپ سی لگی تھی، نا بولا نا باز آیا
خیر اب اُس کی بات کو چھوڑو۔ دیوانا پھر دیوانا
جاتے جاتے ہم لوگوں کا ایک سندیسا لے جانا

آوارہ آوارہ پھرنا چھوڑ کے منڈلی یاروں کی
دیکھ رہے ہیں دیکھنے والے انشاؔ کا اب حال وہی

کیا اچھا خُوش باش جواں تھا جانے کیوں بیمار ہُوا
اُٹھتے بیٹھتے میرؔ کی بَیتیں پڑھنا اُس کا شعار ہُوا
طور طریقہ اُکھڑا اُکھڑا چہرہ پیلا سخت ملول
راہ میں جیسے خاک پہ کوئی مسلا مسلا باغ کا پھُول
شام سویرے بال بکھیرے بیٹھا بیٹھا روتا ہے
ناقوں والو! اِن لوگوں کا عالم کیسا ہوتا ہے

اپنا بھی وہ دوست تھا ہم بھی پاس اُس کے بیٹھ آتے ہیں
اِدھر اُدھر کے قصّے کہہ کے جی اُس کا بہلاتے ہیں
اُکھڑی اُکھڑی بات کرے ہے بھُول کے اگلا یارانا
'کون ہو تم، کس کام سے آئے؟ ہم نے نہ تم کو پہچانا'
جانے یہ کِس نے چوٹ لگائی، جانے یہ کِس کو پیار کرے
تمھی کہو ہم کِس کو ڈھونڈیں؟ آہیں کھینچے نام نہ لے
پیت میں ایسے جان سے یار نہ کتنے لوگ گزرتے ہیں
پیت میں ناحق مر نہیں جاتے، پیت تو سارے کرتے ہیں

اے متوالو ناقوں والو! نگری نگری جاتے ہو
کہیں جو اُس کی جان کا بَیری مل جائے یہ بات کہو
چاک گریباں اِک دیوانہ پھرتا ہے حیراں حیراں
پتھر سے سر پھوڑ مرے گا، دیوانے کو صبر کہاں
تم چاہو تو بستی چھوڑے تم چاہو تو دشت بسائے
تم چاہو تو کچھ دن جی لے دامن سی لے ہوش میں آئے
اے متوالو ناقوں والو ــــ ورنہ اِک دن یہ ہوگا
تم لوگوں سے آتے جاتے پوچھیں گے انشا کا پتا

۱۹۵۳ء

یہ سرائے ہے

یہ سرائے ہے، یہاں کس کا ٹھکانا ڈھونڈو
یاں تو آتے ہیں مسافر، سو چلے جاتے ہیں

ہاں یہی نام تھا کچھ ایسا ہی چہرا مہرا
یاد پڑتا ہے کہ آیا تھا مسافر کوئی
سُونے آنگن میں پھرا کرتا تھا تنہا تنہا
کتنی گہری تھی نگاہوں کی اُداسی اُس کی
لوگ کہتے تھے کہ ہوگا کوئی آسیب زدہ
ہم نے ایسی بھی کوئی بات نہ اُس میں دیکھی

یہ بھی ہمت نہ ہوئی پاس بٹھا کے پُوچھیں
دل یہ کہتا تھا کوئی درد کا مارا ہوگا

لَوٹ آیا ہے جو آواز نہ اُس کی پائی
جانے کِس در پہ کسے جا کے پُکارا ہوگا
یاں تو ہر روز کی باتیں ہیں یہ جیتیں ماتیں
یہ بھی چاہت کے کسی کھیل میں ہارا ہوگا

ایک تصویر تھی — کچھ آپ سے مِلتی جُلتی
ایک تحریر تھی — پر اس کا تو قصّہ چھوڑو
چند غزلیں تھیں کہ لکھیں کبھی لکھ کر کاٹیں
شعر اچھے تھے — جو سُن لو تو کلیجہ تھامو
بس یہی مال مسافر کا تھا ہم نے دیکھا
جانے کِس راہ میں کِس شخص نے لُوٹا اس کو

گزُرا کرتے ہیں سُلگتے ہوئے باقی ایّام
لوگ جب آگ لگاتے ہیں بُجھاتے بھی نہیں
اجنبی بیت کے ماروں سے کسی کو کیا کام
بستیوں والے کبھی ناز اٹھاتے بھی نہیں

چھین لیتے ہیں کسی شخص کے جی کا آرام
پھر بلاتے بھی نہیں، پاس بٹھاتے بھی نہیں

ایک دن صبح جو دیکھا تو سرائے میں نہ تھا
جانے کس دیس گیا ہے وہ دِوانا۔ ڈھونڈو!
ہم سے پوچھو تو نہ آئے گا وہ جانے والا
تم تو ناحق کو بھٹکنے کا بہانا ڈھونڈو
یاں تو آیا جو مسافر یونہی شب بھر ٹھہرا
یہ سرائے ہے۔ یہاں کس کا ٹھکانا ڈھونڈو

۱۹۵۳ء

کاتکؑ کا چاند

چاند کب سے ہے سرِ شاخِ صنوبر اٹکا
گھاس شبنم میں شرابور ہے شب ہے آدھی
بام سُونا ہے، کہاں ڈھونڈیں کسی کا چہرا
(لوگ سمجھیں گے کہ بے ربط ہیں باتیں اپنی)
شعر اُگتے ہیں دُکھی ذہن سے کونپل کونپل
کون موسم ہے کہ بھرپُور ہیں غم کی بیلیں
دُور پہنچے ہیں سرکتے ہوئے اُودے بادل
چاند تنہا ہے (اگر اس کی بلائیں لے لیں)
دوستو جی کا عجب حال ہے، لینا بڑھنا
چاندنی رات ہے کاتک کا مہینا ہوگا
میرِ مغفور کے اشعار نہ پیہم پڑھنا
جینے والوں کو ابھی اور بھی جینا ہوگا

چاند ٹھٹکا ہے سرِ شاخِ صنوبر کب سے
کونسا چاند ہے — کس رُت کی ہیں راتیں لوگو
دُھند اُڑنے لگی — بُننے لگی کیا کیا چہرے
اچھی لگتی ہیں دوانوں کی سی باتیں لوگو
بھیگتی رات میں دبکا ہُوا جھینگر بولا
کسمساتی کسی جھاڑی میں سے خوشبو لپکی
کوئی کاکل، کوئی دامن، کوئی آنچل ہوگا
ایک دُنیا تھی مگر ہم سے سمیٹی نہ گئی

یہ بڑا چاند — چمکتا ہوا چہرہ کھولے
بیٹھا رہتا ہے سرِ بامِ شبستاں شب کو
ہم تو اِس شہر میں تنہا ہیں، ہمیں سے بولے
کون اِس حُسن کو دیکھے گا یہ اِس سے پُوچھو
سونے لگتی ہے سرِ شام یہ ساری دُنیا
ان کے حجروں میں نہ در ہے نہ دریچہ کوئی

اِن کی قسمت میں شبِ ماہ کو رونا کیسا
اِن کے سینے میں نہ حسرت نہ تمنّا کوئی

کِس سے اس دردِ جُدائی کی شکایت کہیے
یاں تو سینے میں نیستاں کا نیستاں ہوگا
کِس سے اِس دل کے اُجڑنے کی حکایت کہیے
سُننے والا بھی جو حیراں نہیں، حیراں ہوگا
ایسی باتوں سے نہ کچھ بات بنے گی اپنی
سُونی آنکھوں میں نراشا کا گھُلے گا کاجل
خالی سپنوں سے نہ اوقات بنے گی اپنی
یہ شبِ ماہ بھی کٹ جائے گی بے کل بے کل

جی میں آتی ہے کہ کمرے میں بُلالیں اِس کو
چاند کب سے ہے سرِ شاخِ صنوبر اٹکا
رات اس کو بھی نِگل جائے گی بولو بولو
بام پر اور نہ آئے گا کسی کا چہرا

۱۹۵۳ء

اے مرے سوچ نگر کی رانی

تجھ سے جو میں نے پیار کیا ہے، تیرے لئے؟ نہیں اپنے لئے
وقت کی بے عنوان کہانی، کب تک بے عنوان رہے
اے مرے سوچ نگر کی رانی، اے مرے خُلدِ خیال کی حُور
اتنے دنوں جو میں گُھلتا رہا ہوں تیرے بِنا یُونہی دُور ہی دُور
سوچ تو کیا پھل مجُھ کو ملا، میں من سے گیا پھر تن سے گیا
شہرِ وطن میں اجنبی ٹھہرا — آخر شہرِ وطن سے گیا
رُوح کی پیاس بُجھائی تھی پر یہاں ہونٹوں کی پیاس بھی بُجھ نہ سکی
بچتے سنبھلتے بھی ایک سُلگتا روگ بنی مرے جی کی لگی
دُور کی بات نہ سوچ ابھی مرے ہات میں تُو ذرا ہات تو دے
تجھ سے جو میں نے پیار کیا ہے، تیرے لئے؟ نہیں اپنے لئے

باغ میں ہے اک بیلے کا تختہ بھینی ہے اس بیلے کی سگندھ
اے کلیو کیوں اتنے دنوں تم رکھے رہیں اسے گود میں بند
کتنے ہی، ہم سے رُوپ کے رسیا آئے یہاں اور چل بھی دیئے
تم ہو کہ اتنے حُسن کے ہوتے ایک نہ دامن تھام سکے
صحنِ چمن پر بھونروں کے بادل ایک ہی پل کو چھائیں گے
پھر نہ وہ جا کر لوٹ سکیں گے پھر نہ وہ جا کر آئیں گے
اے مرے سوچ نگر کی رانی وقت کی باتیں رنگ اور بُو
ہر کوئی ساتھ کسی کا ڈھونڈے گُل ہوں کہ بیلے میں ہُوں کہ تُو
جو کچھ کہنا ہے ابھی کہہ لے جو کچھ سُننا ہے سُن لے
تجھ سے جو میں نے پیار کیا ہے، تیرے لئے، نہیں اپنے لئے

دل کی نہ پوچھو کیا کچھ چاہے، دل کا تو پھیلا ہے دامن
گیت سے گال، غزل سی آنکھیں، ساعدِ سیمیں، برگِ دہن
جُوڑے کے انہی پھولوں کو دیکھو کل کی سی ان میں باس کہاں
ایک اک تارا کر کے ڈوبی ماتھے کی طنّازافشاں

سہنے کا دُکھ سہ نہ سکے، ہم، کہنے کی باتیں کہ نہ سکے
پاس ترے کبھی آ نہ سکے ہم، دُور بھی تجھ سے رہ نہ سکے
کس سے کہے اب رُوح کی بپتا، کس کو سُنائے من کی بات
دور کی راہ، بھٹکتا راہی، جیون رات گھنیری رات
ہونٹوں کی پیاس بُجھانی ہے اب تم رے جی کو یہ بات لگے نہ لگے
تجھ سے جو میں نے پیار کیا ہے، تیرے لئے؟ نہیں اپنے لئے

۱۹۵۴ء

غمِ رائیگاں

پھر بہار آئی ہے پھر کلیوں نے مہکائے ہیں بن
لیکن اے یارو خزاں اچھی کہ سینے کی جلن؟
آج تو بھادوں کی برکھا ہو گئے آنکھوں کے نیر
صبح دم دیکھیں گے اُجلا ہے کہ میلا پیرہن
چاند کن پیڑوں کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ گیا
اس اندھیرے میں قیامت ہو چلی جی کی دُکھن
اپنی راتوں کی فغاں، تیری صدائے پی کہاں
اے پپیہے اپنی قسمت میں کہاں پی کا مِلن؟

کل بھی اندھیارے گھنیرے راستے تاریک تھے
کل بھی اس دامن کی دولت تھا غمِ دل کا غبار
کل بھی بجھ جاتے تھے، جل اٹھتے تھے یادوں کے دیے
کل بھی دل پر ہاتھ جا پڑتا تھا یونہی بار بار

کل بھی آشفتہ تھی افتادہ تھی واماندہ اُمید
اپنے کانوں تک پہنچ پاتی نہ تھی اپنی پُکار
لہریے بُنتے تھے بیتابی سے انجانے سے گیت
جھنجنا اُٹھتے تھے ہر جھونکے پہ غمگینی کے تار

لیکن اتنی بھی سہانی تھی کہاں داغوں کی سیر
جی بیاکل ہی سہی اتنا مگر خود سے نفور؟
آج تو جی کی لگی لینے لگی صدیوں کا بیر
چاند نکلا ہے ــــ کھلے انبر سے لیکن دُور دُور
بن کی پہنائی میں پھر چھائی ہے پھولوں کی سگندھ
آج تو اُن کو بھی اِس محفل میں لانا ہے ضرور
اوس میں بھیگا پپیہا سر پٹک کر سو گیا
اور تُو ــــ؟ تیرا نہیں تیرے ستاروں کا قصور

کارواں در کارواں سپنوں کو لِپٹائے ہوئے
لوگ تو جانے لگے انشاؔ چلو تم بھی چلو
کب تلک اپنے گماں سینے سے چمٹائے ہوئے

بے کفن ۔ لے کے پھرو گے چاندنی کی لاش کو
کون سے پی سے لگائی ہے اُمیدِ بازدید
کون سے پی کے لئے بیتیں کہو غزلیں لکھو
چاند میلا ہے، ستارے دُور ہیں، لمبی ہے رات
بیکراں ہے دردِ مہجوری کا ساگر دوستو

تم پہ تو بے نام جادو کر گئی کرنوں کی بات
لوٹ جائے گی مگر شب بھر چمک کر چاندنی
دل کی ہر دھڑکن کو دے جائے گی صدیوں کا ثبات
بے اماں، بے مہر، بے پروا، ستمگر چاندنی
دن کو کس کلفت سے پہنچاتی ہے وحشت تا بہ شام
اور پھر کھولے ہے جو دُکھڑوں کا دفتر چاندنی
جانے کس کس آس کی پاداش ہیں اپنے نصیب
یعنی اکثر عشق، اکثر درد، اکثر چاندنی

سال آتے ہیں گزر جاتے ہیں رہتا ہے وہیں
بے شکن بستر کو مہکاتا ہوا کلیوں کا ڈھیر

ہم جو ہرجائی نہیں پھر کوئی ہرجائی نہیں
ایک اِک سپنے میں اک مہوش ہے اور کتنا دلیر
یونہی بے پوچھے ہی در آتا ہے ہر تازہ خیال
یونہی ہر قامت کے اپنانے میں ہو جاتی ہے دیر
گونجتی ہیں من کی ویرانی میں کیا کیا آہٹیں
اور یوں ہر شام کی ہوتی ہے مشکل سے سویر

دل کی انگنائی کو گرماتی ہے ہر موسم کی دُھوپ
کون جانے باغ میں اب کے ہے کِس رُت کا چلن
اتنے دامن، اتنے آنچل، اتنے چہرے، اتنے رُوپ
کونسی ان میں سے ہے اپنے خیالوں کی دُلہن
آسماں ہے، وادیٔ انجم ہے، تنہا چاند ہے
کوئی دیوانہ پسِ محمل رواں خود میں مگن
اور یاروں کو ابھی ضد ہے کہ اُٹھ کے دیکھ لو
پھر بہار آئی ہے پھر کلیوں نے مہکائے ہیں بن

۱۹۵۲ء

ایسی راتیں بھی کتنی گزری ہیں

کہاں گیا تھا — گھڑی دو گھڑی میں لوٹ آیا
شبِ فراق کا تارا — رکاب میں لایا
اُداس شام — ابھی کتنی رات باقی ہے!

یہ آج کونسی تاریخ تھی مہینے کی
مہِ تمام سرِ آسماں اُبھر آیا
مہِ تمام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

سُنو سُنو وہ کسی دُور کے محلّے میں
ادائے خاص سے ہے پہرہ دار چلّایا
کسی کا نام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

وہ چرچ روڈ کے گھنٹے نے دو بجا بھی دیئے
وہ پھیل پھیل چلا نیم کا گھنا سایا
بہ صحن و بام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

یہ کس کے پاؤں کی جھانجن تھی کس نفس کی سگندھ
یہ کس کے رُخ کا اُجالا ہوا تھا — کون آیا
خیالِ خام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

حریفِ مرحلۂ ہفت خواں ہے منزلِ عشق
اسی طرح جو دلِ بے قرار بھر آیا
بہر مقام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

ستارۂ سرِ مشرق غبارِ رہ سے ملول
دیارِ دُور سے یاں تک تُو کس طرح آیا
بہ ایں خرام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

اُفق پہ غولِ بیاباں ہے یا سپیدۂ صُبح
شبِ فراق تجھے یاں تلک تو پہنچایا
بہ اہتمام — ابھی کتنی رات باقی ہے؟

۱۹۵۳ء

لوگ پوچھیں گے

لوگ پوچھیں گے کیوں اداس ہو تم
اور جو دل میں آئے سو کہیو!
'یُونہی ماحول کی گرانی ہے،
دِن خزاں کے ذرا اُداس سے ہیں'
'کتنے بوجھل ہیں شام کے سائے'
اُن کی بابت خموش ہی رہیو
نام اُن کا نہ درمیاں آئے

نام اُن کا نہ درمیاں آئے

اُن کی بابت خموش ہی رہیو

'کتنے بوجھل ہیں شام کے سائے'

'دن خزاں کے ذرا اُداس سے ہیں'

'یُونہی ماحول کی گرانی ہے'

اور جو دل میں آئے سو کہیو!

لوگ پوچھیں گے کیوں اُداس ہو تُم؟

۱۹۷۸ء

سائے سے

کیوں مرے ساتھ ساتھ آتا ہے؟
میری منزل ہے بے نشاں ناداں؟
ساتھ میرا ترا کہاں ناداں؟

تھک گئے پاؤں، پڑ گئے چھالے
منزلیں ٹمٹما رہی ہیں دُور—!
بستیاں اور جا رہی ہیں دُور—!

میں اکیلا چلوں گا اے سائے
کون عہدِ وفا نبھاتا ہے؟
کیوں مرے ساتھ ساتھ آتا ہے؟

تُو ابھی جا ملے گا سایوں میں
میں کہاں جاؤں میں کہاں جاؤں؟
کِس کی آغوش میں اماں پاؤں

۱۹۴۴ء

انتظار کی رات

اُمڈے آتے ہیں شام کے سائے
دم بدم بڑھ رہی ہے تاریکی
ایک دُنیا اُداس ہے لیکن
کچھ سے کچھ سوچ کر دلِ وحشی
مُسکرانے لگا ہے — جانے کیوں؟

وہ چلا کارواں ستاروں کا
جھومتا ناچتا سُوئے منزل
وہ اُفق کی جبیں دمک اُٹھی
وہ فضا مُسکرائی — لیکن دل
ڈُوبتا جا رہا ہے — جانے کیوں

۱۹۴۵ء

وہ دریچے

کب سے اس چوک میں کھڑا ہوں میں
اُن دریچوں کو تک رہا ہوں میں
ہائے کیا یاد آگیا اے دوست
ذکر ہے پار سال کا اے دوست
بارہا سیر کے لئے جاتے
میں نے اس راہ سے گزرتے ہُوئے
ایک مدقُوق سا حسیں چہرہ
اِن دریچوں سے جھانکتے دیکھا
کتنے موہوم ولولے جانے
ہر نظر میں تڑپ رہے ہوتے
جیسے کوئی خزاں زدہ پودا
ہو یہی سوچ سوچ کر جیتا

ہیں کوئی دن — یہ انتظار کے دن
پھر پلٹ آئیں گے بہار کے دن

جا کے پردیس لوٹ آیا ہوں
اور اسی راہ سے گزرتا ہوں
لیکن اے دوست اب کبھی میں نے
یہ دریچے کھُلے نہیں دیکھے

حُسنِ بیمار مر گیا شاید

سوچتا ہوں خزاں زدہ پودا
انتظارِ بہار کر نہ سکا
تھا بہاروں سے آشنا شاید

۱۹۴۴ء

اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے

(ایک نامربوط کہانی)

۱۔ یہ خلش کہاں سے ہوتی

تُو کہے جائے گا کب تک کہ ہُوا کچھ بھی نہیں
اے دل اس درد کی سُنتے ہیں دوا کچھ بھی نہیں

کس لئے چین سے محروم ہیں اپنے شب و روز
کچھ سمجھ میں نہیں آتا، بخدا کچھ بھی نہیں

مہرباں بھی ہیں، محبّت بھی ہے ان کو ہم سے
لوگ کہتے ہیں، مگر ہم کو پتا کچھ بھی نہیں

آزمائیں تو سہی جذبِ محبت انشاؔ
ان کی نظروں میں چلو مان لیا کچھ بھی نہیں

۲- دل و جانم بتو مشغول و نگاہم چپ و راست
تا نہ دانند حریفاں کہ تو منظورِ منی

اے تو کہ ترے حُسن کا شہرہ ہے جہاں میں
کیوں عشق پہ احسان گوارا نہیں تجھ کو
یہ برہمی نشتر ہے ہماری رگِ جاں میں
کیوں پاس کچھ اے دوست ہمارا نہیں تجھ کو

کچھ لُطفِ شبانہ کی نہ خوشبُو کی ہوس ہے
ہم رنگ پرستوں کی جسارت پہ نہ جانا
اک لمحۂ شیریں کا ہمیں لمس ہی بس ہے
اے غنچۂ نو یافتہ پہلو نہ چُرانا

ہم آہ بھریں، نالہ کریں، کچھ نہ کہیں تو
سب تیرے لئے۔ تجھ کو یقیں آئے نہ آئے
یاروں نے کبھی کیفیتِ درد جو پوچھی
ہم نے انہیں برجستہ فسانے ہی سُنائے

پر تم سے تو پوشیدہ نہیں اپنی حکایت
اس رشتۂ نازک کو نہ اُلجھاؤ تو اچھا
اب اور بڑھاؤ نہ غمِ صبر طلب کو
اب پردۂ دُوری سے نکل آؤ تو اچھا

۳ - کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ
زلف برہم کئے، با چشمِ حجاب آلودہ

بالوں میں ترے شانہ بنیں انگلیاں میری
باہوں کو تری تکیۂ رخسار بنایا
چپکے سے کبھی ڈوب گیا چاہِ ذقن میں
زلفوں کو لبوں سے کبھی پلکوں سے لگایا

اس شب کی سحر برقِ بلا تھی کہ چھلاوا
اس رات نہ خستہ تھے نہ واماندہ ستارے
رخسار ترے سینۂ بریاں سے لگا کے
ہم سو نہ سکے کلفتِ ایام کے مارے

پھر سر پہ تھا خورشیدِ حقیقت کا اُجالا
پھر خواب پریشاں تھے خیالوں کی رہوں میں
تم تھے کہ تصوّر ہی سے آباد تھی دُنیا
سرگوشیاں ہوتی ہی رہیں خواب گہوں میں

کچھ تجھ کو خبر ہے کہ غمِ نیم شبی میں
میں تیری عنایت کے سہارے ہی جیا تھا
وحشت کے بیاباں میں مری تشنہ لبی نے
انعام میں اک قطرۂ شبنم ہی پیا تھا

لیکن اسی اِک قطرۂ شبنم کی طلب میں
اُمید سے محروم جہاں گرد تھا کب سے
اس کی بھی نظر میں تھی یہ دزدیدہ نگاہی
راہی کو گذرنا تھا مگر منزلِ شب سے

اب موت گوارا نہ ترا ہجر گوارا
ہم منتظرِ آمدِ فردا ہی رہیں گے
تُو خوب سمجھتا ہے نگاہوں کی زباں کو
کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کچھ نہ کہیں گے

۴۔ دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

تمہیں تعجب ہوا ہے شاید، مجھے جو ہے عشق تم سے کیوں ہے
کہ تم سے بڑھ کے حسیں تو مجھ کو ہر ایک کوچے میں مل سکے گا
تم اپنے دل میں سمجھ رہے ہو، یہ خام کاری ہے یا جنوں ہے
ذرا تغافل سے کام لو گے تو خود ہی میدان چھوڑ دے گا

ابھی یہ کل ہی کی بات ہے تم کو اس قدر تھا خیال میرا
کہ شاید اپنے یہ جبر کر کے بھی میری ہر بات مانتے تھے
ابھی یہ کل ہی کی بات ہے تم اداس لمحاتِ نیم شب میں
مرے دلِ شیفتہ کی تسکیں کو حاصلِ زیست جانتے تھے

تو پھر یہ اپنا قصور مانو — تمھی نے لمحاتِ نیم شب میں
مرے دلِ دردمند کو ایک آرزوئے حیات بخشی
مجھے تو اس رات کی سحر کی نہ آرزو تھی نہ یہ خبر تھی
کہ اس سفینے کو غم کا ظلمات پار کرنا ہے لازمی بھی

میں دُور رکھوں گا خود کو تم سے تمہارے گھر بھی نہ آؤں گا
مگر تم اپنی شفیق نظروں میں اجنبیت سمو سکو گے
اگر میں راتوں کو کاہشِ غم سے تا سحر جاگتا رہوں گا
تو اس قدر پاس رہ کے بھی مجھ سے اس قدر دُور ہو سکو گے؟

مجھے تو منظور ہے یہ سب کچھ میں رو کے جی لوں سسک کے جی لوں
مگر مری ایسی زندگی پر تمھی کو شاید ملال ہوگا
نہ جانے کس کس شفیق دل پر یہ شاق گزرے گا میرا مرنا
مرا مرض لا دوا نہیں تھا — مگر یہ کس کو خیال ہوگا

۵۔ ایک غزل مُناسبِ حال

دل نے ہمارے بیٹھے بیٹھے کیسے کیسے روگ لگائے
تم نے کسی کا نام لیا اور آنکھوں میں اپنی آنسو آئے

جتنی زبانیں اتنے قصّے اپنی اُداسی کے کارن کے
لیکن لوگ ابھی تک یہ سادہ سی پہیلی بُوجھ نہ پائے

عشق کیا ہے؟ کس سے کیا ہے؟ کب سے کیا ہے؟ کیسے کیا ہے؟
لوگوں کو اک بات ملی اپنے کو تو لیکن رونا آئے

راہ میں یُونہی چلتے چلتے اُن کا دامن تھام لیا تھا
ہم ان سے کچھ مانگیں چاہیں ہم سے تو یہ سوچا بھی نہ جائے

نجمِ سحر کے چہرے سے انشاؔ اتنی بھی اُمیدیں نہ لگاؤ
ایسا بھی ہم نے دیکھا ہے اکثر رات کٹے اور صبح نہ آئے

۔ لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

شامِ جدائی پھر لوٹ آئی سوئے ہوئے فتنوں کو جگایا
اِک بے نام کسک کے ہاتھوں، بات بات پر دل بھر آیا

آج بھی شاید ساتھ تمہارا منزل تک دینا ہے ستارو
پہلے بھی ہم نے اکثر تم کو صبح کی وادی تک پہنچایا

آنکھ مچولی کھیلا کریں گے کب تک یہ راتوں کے دُھندلکے
چاپ چاپ پر دل پوچھے گا یہ کون آیا یہ کون آیا
انشاؔ جی پھر اتنے سویرے صبر کا دامن چھوڑ رہے ہو
پچھلی رات کا درد ابھی تک سینے سے مٹنے نہیں پایا

۷۔ شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

دل درد میں گُھلتا رہے، یہ کس کو گوارا ہے
ہم کو تو مگر یارو، یہ درد ہی پیارا ہے
امّید کا ہر لمحہ اب وصل کا لمحہ ہے
جب دُور کنارا ہو، ہر موج کنارا ہے
اس زُلف نے اپنے کو کیا کیا نہیں اُلجھایا
جس زُلف کو خود ہم نے سو بار سنوارا ہے
وہ رات گئی انشاؔ، وہ بات گئی انشاؔ
اب کس لئے جیتے ہو، اب کس کا سہارا ہے

۱۹۵۰ء

وغیرہ وغیرہ

اِنشا نے پھر عشق کیا

(ایک اور نامربوط کہانی)

نشا نے پھر عشق کیا   انشا صاحب دیوانے

پنے بھی وہ دوست ہوئے   ہم بھی چلیں گے سمجھانے

۱۔ پیمانِ محبوب سے:

اپنے کو ہم اِس شہر میں رُسوا نہ کریں گے
اب تک جو ہوا خیر، اب ایسا نہ کریں گے
وعدہ ہے کہ اب اور جلائیں گے نہ جی کو
نقصان ہے اس میں تو یہ سودا نہ کریں گے
تا شام نہ ان کوچوں میں گھومیں گے پریشاں
تا صبح شبِ ماہ میں جاگا نہ کریں گے

ہر موڑ پہ ٹھٹکیں گے نہ دیوانوں کی صُورت
ہر در پہ تجھے جا کے پُکارا نہ کریں گے
لکھیں گے کسی اور ہی عنوان کی نظمیں
غزلوں میں بھی اس بات کا چرچا نہ کریں گے

۲۔ باتیں اپنے دل کے ساتھ

وعدہ تو کیا ہے مگر ایفا نہ کریں گے
ایفا جو کریں گے کوئی اچھا نہ کریں گے
لوگوں سے چھپا لیں گے جو احوال ہے جی کا
اپنے سے کسی بات میں دھوکا نہ کریں گے
اے دل ترے فرمانوں کو ٹالا ہے نہ ٹالیں
اُن کی بھی ترے سامنے پروا نہ کریں گے
اِس راہ کو ہم چھوڑ کے جائیں کِسی جانب
آزردہ نہ ہو۔ ہم کبھی ایسا نہ کریں گے
لکھیں گے اُسی ٹھاٹ سے نظمیں، کبھی غزلیں
ہاں آج سے لوگوں کو دکھایا نہ کریں گے

۳۔ خطاب کسی دوست کا لوگوں سے:

ہم نے نہ کہا تھا کہ وہ کیا کیا نہ کریں گے
ہاں صبر کی کہتے ہو تو انشاؔ نہ کریں گے

بڑھ جائے گا آزارِ محبّت ہے یہ لوگو
وہ ایک نظر دیکھ کے اچھا نہ کریں گے؟

اُن سے یہ کہو ایسے دوانوں سے نہ اُلجھیں
سُن لیں گے مگر آپ کا کہنا نہ کریں گے

سائل ہیں فقط ایک عنایت کی نظر کے
یہ اور کسی شے کا تقاضا نہ کریں گے

در سے نہ اٹھائیں وہ ضمانت پہ ہماری
رُسوا ہیں مگر آپ کو رُسوا نہ کریں گے

۴۔ باب چہارم ــــ در مسافرت

وہ جی میں کوئی بات جو لاتے ہیں عزیزو!
یہ سب نہ کریں گے، چلو اچھا نہ کریں گے

تنہائی میں لے جائیں گے سمجھائیں گے دل کو
یہ مان بھی جائے گا یہ دعوے نہ کریں گے

اتنا ہے کہ چھوڑیں گے یہ دیوانوں کی صورت
ہم کل سے سرِ راہ بھی بیٹھا نہ کریں گے

ہو جائیں گے جاکر کہیں پردیس میں نوکر
یاں سال میں اک بار بھی آیا نہ کریں گے

اس شہر میں آئندہ نہ دیکھیں گے وہ ہم کو
کیا کیا نہ کیا عشق میں، کیا کیا نہ کریں گے!

۱۹۵۴ء

فروگزاشت

درد رُسوا نہ تھا زمانے میں
دل کی تنہائیوں میں بستا تھا
حرفِ ناگفتہ تھا فسانۂ دل
ایک دن جو انہیں خیال آیا
پوچھ بیٹھے: "اُداس کیوں ہو تم"؟
"بس یونہی"، مُسکرا کے میں نے کہا
دیکھتے دیکھتے سرِ مژگاں
ایک آنسو مگر ڈھلک آیا
عشق نورس تھا — خام کار تھا دل!

بات کچھ بھی نہ تھی مگر ہمدم
اب محبّت کا وہ نہیں عالم
آپ ہی آپ سوچتا ہوں میں
دل کو الزام دے رہا ہوں میں
درد بے وقت ہو گیا رُسوا
ایک آنسو تھا پی لیا ہوتا
حُسن محتاط ہو گیا اُس دن
عشق توقیر کھو گیا اُس دن
ہائے کیوں اتنا بے قرار تھا دل

۱۹۴۷ء

اُداس رات کے آنگن میں

اُداس رات کے آنگن میں رات کی رانی
مہک رہی ہے — دلِ بے قرار بات تو سُن
فلک پہ نِکلا ہے پیلا دُھلا دھلایا چاند
کہاں سے چل کے کہاں تک ہے دیکھ آیا چاند
کوئی خیال — کوئی یاد — آرزو کوئی
بڑے بہانے تھے جی کے گُداز کرنے کو

مگر تو چُپ ہے سرِ آغازِ شام سے چُپ ہے
شبِ اگست کے افسانہ خواں دُھندلکے میں
چٹک رہی ہے — پڑی گھولتی ہے ویرانی
اُداس رات کے آنگن میں رات کی رانی

گھڑی کی سوئیاں پیہم خرام آمادہ
مگر مسافرِ شب ، خستہ جان اُفتادہ
گزرتے وقت کی وادی میں ایک منزل پر
ٹھٹک گیا ہے غُبارِ نجوم میں کھو کر
کہ ایک ریل کی سیٹی خموش مدھم سی
اُجالتی ہے تمنّا کی رہگزارِ بعید

سوادِ شہر کی بستی کا یہ شکستہ پُل
گئی بہار کی بے برگ و بار بیلوں میں
اُلجھ گیا ہے — مگر پوچھیئے تو بیگانہ،

بُجھا بُجھا سا دِیا کوئی جھلملاتا ہے،
سوادِ شہر کی بستی کی خانقاہ کے پاس
کہ رفتگانِ رہِ دُور کا مجاور ہے

یہ رہگزار وہی جس سے ساربانوں کا
علی الصباح گزرتا ہے قافلا کوئی
تمام رات پڑی کروٹیں بدلتی ہے
نہ جانے کس کے غمِ انتظار میں بے چین،

بہت ملول بہت زرد ہو چلا ناگاہ
ابھی تو دیکھا تھا ہم نے دُھلا دُھلایا چاند
کہاں سے آیا ہے کیسا پیام لایا چاند

اُجاڑ بستیوں ویران راستوں میں اُداس
بھٹکنے والے کو اب بھی صدائیں آتی ہیں
گزرتے قدموں گلوگیر سرد آہوں کی
مگر مسافرِ شب کاروانِ رفتہ ہیں
کسی کو کس طرح آوازِ پا سے پہچانے
یہ لوگ اس کے لئے آشنا نہ بیگانے

گزر بھی جا تو ہماری طرف ٹھٹک کے نہ دیکھ
گُھلے ملے سے نقوشِ خفی کے ابرِ رواں
کہ وسعتیں ہیں سبہ آسماں کی بے پایاں

تُو کون شہرِ وفا کا کوئی پیامی ہے؟
ترے جو دل میں کوئی داغِ ناتمامی ہے
شبِ الست شبِ بے قرار کے مہتاب
شبِ دوازدھم کے دُھلے دُھلائے چاند
مرے عزیز کہیں اور جا کے دستک دے
کہ اس جوار کے لوگوں کو جانتا ہے تو
کہ یہ نواح کئی سال سے ہے کم آباد
رہا نہیں ہے محبّت کے کام کا کوئی
نہیں یہاں نہیں انشاؔ کے نام کا کوئی!

۱۹۵۴ء

واپسی

بستیاں قریے گھوم چکے اب دشت کو لوٹیں بن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو! آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں

"تم اور ہم سے پیار کرو گے؟ جھوٹ ہے لوبھی بنجارو
بیچو گے بیوپار کرو گے، تم سے دور بھلے پیارو"

بیٹھا ہے وہ جو آگ جلائے، کھوہ کے مُنہ پر چرواہا
وہ بھی ہے تیر کمان سجائے، اس سے بھی ہم کو بچنا ہوا

پچھم میں جہاں پیڑ گھنے ہیں، ان سے بھی لوگو دور ہی دور
ان میں وہ اپنی جان کے بیری چیتے باگھ چھپے ہیں ضرور

ہر کوئی دیکھ کے جال بچھائے، ہر کوئی اُٹھ کے وار کرے
بستیاں قریے گھوم چکے ہم، کوئی نہ ہم سے پیار کرے

لائے تھے ہم اسے کس کو دکھانے، لے چلیں دُکھتے من کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو، آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں

۱۹۵۴ء

صبا کا ایک جھونکا

گُلشن سے صبا کا ایک جھونکا بیگانہ صفت گزر گیا ہے

شکلیں نہیں ذہن میں گلُوں کی
باتیں نہیں یاد دوستوں کی
کرتے رہے لوگ کچھ اشارے
آتے رہے کاکلیں سنوارے
ہونٹوں پہ تبسّموں کا جادو
آنکھوں میں 'عجیب شخص ہے تُو'

دل اجنبی اجنبی بچارا
یہ حیرتوں حسرتوں کا مارا
بیٹھا رہا سوز سا جگائے
یعنی: 'کوئی اس طرف نہ آئے'

گلشن کا ہر اک نہال چونکا
گلشن سے صبا کا ایک جھونکا
بیگانہ صفت گزر گیا ہے

دل کا ہے عجیب حال لوگو آتا ہے تمہیں خیال لوگو؟
ایسے بھی ہیں نجد میں دوانے
رہتے ہیں جو عشق میں بھی سیانے
کہنے میں کبھی نہ جی کے آئیں
اپنے سے بھی آپ کو چھپائیں
دل میں تو ہزار آرزو ہے
ہونٹوں پہ کچھ اور گفتگو ہے
لوگوں نے کبھی جو حال پوچھا
'کیسے ہو کہو': سوال پوچھا
کہنا یہی' آپ کی دعا ہے
بیگانہ صفت گزر گیا ہے

گلشن سے صبا کا ایک جھونکا

گلشن سے خراب لوٹ آئے ہم نے تو یہ سال بھی گنوائے

گلشن تھا کہ قریۂ نگاراں
اپنے یہ نصیب تھے نہ یاراں
کلیوں سے گلوں سے پیار کرتے
وحشت کوئی اختیار کرتے
چٹکا کیا دل کا ایک گھاؤ
کلیوں نے بھی کہہ دیا کہ جاؤ!
مانگو ہی نہیں تو تم کو کیا دیں
کافی ہیں تمہیں ہماری یادیں
جی میں تھا غبار حسرتوں کا
سینہ تھا مزار حسرتوں کا
گلشن سے صبا کا ایک جھونکا
بیگانہ صفت گزر گیا ہے

۱۹۵۳ء

ڈھلتی رات

ڈھلتی ہوئی رات کی خموشی
بستی کی فضا پہ چھا گئی ہے
ڈیوٹی ہے طویل سنتری کی
کتّوں کو بھی نیند آ گئی ہے

گرجا کی گھڑی نے جھنجنا کر
چپکے سے جو دو بجا دیئے ہیں
لوگوں نے گرا لیئے ہیں پردے
لوگوں نے دیے بجھا دیئے ہیں

ہارا ہوا مارکٹ کا مزدور
ٹھیلے پہ دراز ہو گیا ہے
نالے ہی پہ اونگھتا ہے بیٹھا
پٹڑی ہی پہ پڑ کے سو گیا ہے

سگرٹ تک کی بند ہیں دکانیں
سنما بھی اُجڑ چکے ہیں سارے
اِکّا ہے نہ بس نہ گھوڑا گاڑی
بوجھل ہیں قدم تھکن کے مارے

کونوں میں دبک گئے ہیں آخر
پردوں سے وہ جھانکتی نگاہیں
روزن ہیں تمام خالی خالی
جلوے نہ لگاوٹیں نہ آہیں

تاروں کی اُداس اُداس پلکیں
کہتی ہیں اِنہیں بھی کچھ ہوا ہے
کیسے بھلا سوئیں آنکھ جھپکیں
اب چاند جو سر پہ آگیا ہے

ہم سے تو اِسے غرض نہ ہوگی
جانے یہ کسے بلا رہی ہے
گونجی ہے کہیں پہ کوئی سیٹی
کس شہر کی ریل جا رہی ہے

سِگنل کے دیے کی ایک چشمک
کہتی ہے ہزار ہا کتھائیں
ہم کو بھی قرار کی طلب ہے
کس در پہ چلیں، کِسے جگائیں

۱۹۵۱ء

پچھلے پہر کے سنّاٹے میں

پچھلے پہر کے سنّاٹے میں
کس کی سسکی کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں دَر آیا ہے

زور ہوا کا ٹوٹ چکا ہے
کُھلے دریچے کی جالی سے
ننّھی ننّھی بُوندیں چھن کر
سب کونوں میں پھیل گئی ہیں
اور مرے اشکوں سے
اُن کے ہاتھ کا تکیہ بھیگ گیا ہے

کتنی ظالم
کتنی گہری تاریکی ہے
کھُلا دریچہ تھر تھر تھر تھر کانپ رہا ہے
بھیگی مٹّی سوندھی خوشبُو چھوڑ رہی ہے

اودے بادل،
کالے انبر کی جھیلوں میں ڈوب گئے ہیں
کس کے رخساروں کی لرزش دیکھ رہا ہوں
کس کی زلفوں کی شکنوں سے کھیل رہا ہوں
چپکے چپکے لیٹے لیٹے سوچ رہا ہوں
پچھلے پہر کا سنّاٹا ہے
کس کی سسکی کس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

گھنے درختوں میں پُروا کی سیٹی گونجی
دود کشوں میں قیدی روحیں چیخ رہی ہیں

کونوں میں دبکے ہوئے جھینگر چلّاتے ہیں
محرابوں سے بھوتوں کے سر ٹکراتے ہیں
قلعے کے اک بُرج کے اندر
ایک پری (شیلاٹ کی رانی)
خندق کے اَن دیکھے پانی کی گہرائی
اندیشے کے بالشتوں سے ماپ رہی ہے

ماضی کی ڈیوڑھی کی چلمن
کھُلے دریچے کی جالی سے
چھن چھن آئیں
رُوپ کی جوت حنا کی لالی کل کی یادیں
سوندھی خوشبو ٹھنڈی بُوندیں
کل کے باسی آنسو جن سے
فردا کے بالیں کا پردا بھیگ رہا ہے

سحر زدہ محبوس حسینہ
سپنوں کے شیلاٹ کی رانی
آئینوں میں حُسنِ شکستہ دیکھ رہی ہے
کتنے چہرے ٹوُٹے ٹوُٹے
پہچانے اَن پہچانے سے
آگے پیچھے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
قلعے کے آسیب کی صورت
کِس کی سِسکی کِس کا نالہ
کمرے کی خاموش فضا میں در آیا ہے

بچھڑے لوگو پیارے لوگو
چاہیں بھی تو نام تمہارے جان سکیں گے؟
کیسے مانیں تم کو ہمارے
جی لینے کی مر لینے کی
خوشی ہوئی، افسوس ہوا ہے

تم کیا جانو
کِس کے ہاتھ کا تکیہ
کِس کے گرم اشکوں سے بھیگ رہا ہے
کُھلے دریچے کی جالی سے چمٹی آنکھو
اِک لمحے کے کوندے میں تم
کِن کِن اجنبی چیزوں کو پہچان سکو گی

جیون کھیل میں ہارے لوگو
بچھڑے لوگو پیارے لوگو
برکھا کی لمبی راتوں میں
کمرے کی خاموش فضا میں
پچھلے پہر کے سنّاٹے میں
روتے روتے جاگنے والے
ہم لوگوں کو سو لینے دو
اور سویرا ہو لینے دو

۱۹۵۳ء

خزاں کی ایک شام

شام ہوئی پردیسی پنچھی گھر کو بھاگے
دل اپنا ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے

پت جھڑ تو نے کس کس کو حیران کیا ہے؟
"باغ سے پھول اور پھول سے بھونرا چھین لیا ہے"

بھیڑیں کیوں کھیتوں کے چکر کاٹ رہی ہیں؟
"مینڈوں سے اُڑتی مٹی کو چاٹ رہی ہیں"

پچھوا تو نے اپنی سوندھی باس گنوائی
"آج سے میں نے اگلی رُت کی آس گنوائی"

پودے تُو کیوں سوکھ رہا ہے زرد ہؤا ہے؟
"اِس جنگل میں جینے سے جی سرد ہؤا ہے"

سپنوں کی پریوں کے آنچل چُوم رہے ہیں
ہم بھی چُپ چُپ تنہا تنہا گھُوم رہے ہیں

کیسے اُجڑی بستیوں کو آباد کرو گے
لوگو کل تم ہم لوگوں کو یاد کرو گے

دل اپنا، ہم کھول کے رکھیں کس کے آگے
شام ہوئی پردیسی پنچھی گھر کو بھاگے

۱۹۵۴ء

چل سو چل

جس دن کی رہ دیکھی انشاؔ اتنے برسوں آج اور کل
وہ دن آیا بیت گیا من پھر بھی رہا بوجھل بوجھل

پھاگن آئے ساون آئے اس دھرتی کا حال وہی
گدلا انبر، اجڑی کھیتی، پھلواری میں پھول نہ پھل

کس کو بتائیں من میں ہمارے مات کے گھاؤ کیسے ہیں
آج کہ اک دنیا کی نظر میں ایک ہمیں، ہم ہیں پاگل

ٹوٹا ساہس دھندلی بٹیا ریت کے تودے گام بہ گام
وقت کا کوڑا سڑ سڑ سڑ سڑ چیخ رہا ہے 'چل سو چل'

آج تو اپنی ایک ڈگر ہے اپنے سبھی یاروں سے جُدا
اپنا جہاں اپنا ہی جہاں ہے یا جادُو کا گنگ محل

اِس رُت میں تو اور بھی اُجڑی لگتی ہے من کی بگیا
کمھلائے سبھی گُل بوٹے آشا کی لتا نینوں کے کمل

باغ نے کتنی کلیاں کھوئیں بستی تک پہنچی خوشبُو
آنکھ سے کتنے نیر بہے ہیں دامن تک پہنچا کاجل

عقل نے سودا اور کیا ہے گھاٹا کھا اور مول گنوا
بنجارے اس راہ کو چھوڑ، اے بنجارے اس پینٹھ سے چل

یعنی اِس بازار میں دل کو اک انٹی میں بیچ دیا
اس یُوسف کے دل کی کامنا ہونی تھی اس طور سپھل

شہرِ جنوں سے دشتِ جنوں تک کتنی مسافت تھی انشاؔ
ایک ہمیں لوٹ آئے ہیں ورنہ یار گئے سب دُور نکل

۱۹۴۹ء

سرائے

نگر پرایا، چیت مہینا، سُونی رات، سرائے
دیواروں پر میلے میلے پھیلے پھیلے سائے
آنے والی کل کا چھلاوا ایک جھپک دکھلائے
کیا کیا سوانگ رچائے

گھڑی کی سوئی، صدیاں بیت چکیں تو ایک بجائے
اس کی بیل نہایت نربل چھایا سے شرمائے
اندھا دیپک متوالی پروا کے تھپیڑے کھائے
کانپ کانپ رہ جائے

نیلم نیل آکاش پہ اپنا پیلا جال بچھائے
گُھم گُھم سندیسوں سے اپنے پاس بُلائے
چنچل چندا دُور دُور سے دیکھے اور مسکائے
لیکن ہاتھ نہ آئے

دل پر سوچ، پُرانی بیرن رہ رہ چوٹ لگائے
ناحق تم نے منزل منزل پتھ پتھ دیپ جلائے
چار کوٹ وہی گھور اندھیارا، چار کوٹ اپنائے
دن دن بڑھتا جائے

گھوں گھوں گھوں گھوں چرخی گھومے پہیہ شور مچائے
شپ شپ شپ شپ پٹوں میں لپٹی قسمت چکر کھائے
کہیں تو چکی موٹا پیسے، میدا کہیں بنائے
اور کہیں تھم جائے

ٹٹ ٹٹ ٹٹ ٹٹ بیل کی جوڑی گھومے سیس جھکائے
ہل کی نوک لکیریں کھینچے، لیکھ کے بھید بتائے
ہلواہا جہاں صبح سمے تھا شام کو جب سستائے
وہیں ستارے پائے

پھر زہری بمبار فضا پر جھپٹے اور غرّائے
پورب دیس دھوئیں کا بادل آگ پڑا برسائے
پچھم کے گِدھوں کے لشکر آئے پرے جمائے
لاشوں پر منڈلائے

○

کبھی عقاب، کبھی سونتنیدکا اک آئے اک جائے
جنگ کا لُو کا گھر کھیتی کھلیان پڑا جھلسائے
کہیں تو بے رُت ہولی کھیلے، کہیں بسنت منائے
رُوپ انوپ دکھائے

کال کے کالے کالے راچھس چار کوٹ میں چھائے
انتڑیوں میں بُھوک کی کرچیں جہاں تہاں ہرجائے
گوداموں پر خونی پہرے کھوے سے کھوا ملائے
سنگینیں چمکائے

شہر کا قاضی فتوے چھاپے، گلی گلی پھیلائے
موڑ موڑ پر دُکھیا گوری یاد کے دیپ جلائے
سوچ رہی ہے اتنے دن میں کتنے پاپ کمائے
کِس کو گنتی آئے

ہم جاگیر قلم کی لے کر کیا کھوئے کیا پائے
شبد منوہر، بول کٹیلے، رمزیں اور کنائے
سب غزلوں کے کہنے والے کویوں نے اپنائے
اپنے ہاتھ نہ آئے

پیت کی میٹھی باتیں چھوڑیں پھوڑیں اور پچھتائے
دھرتی کے بیٹوں کی بپتاؤں کے آلھے گائے
چوروں کی مانند ندھی مشکوں میں پکڑے آئے
دیوانے کہلائے

یاروں کا اک غول چھنا چھن جیبوں کو چھنکائے
ان لوگوں نے چاکریوں میں سستے ٹکے کمائے
انشا جیسے ایک بار جھکے تو ہوئے پرائے
کوئی نہ دھوکا کھائے

نگر پرایا، چیت مہینا، سونی رات، سرائے
دیواروں پر میلے میلے پھیلے پھیلے سائے
آنے والی کل کا بھروسہ دن دن اٹھتا جائے
یارو کوئی اُپائے!
یارو کوئی اُپائے!!

۱۹۵۲ء

ریختہ

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ

○

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشاجی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

پینا پلانا عین گنہ ہے ، جی کا لگانا عین ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں لیکن بھری بہار کے بیچ

اے سخیو اے خوش نظرو یک گونہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھریں ہیں صبح سے شہرِ نگار کے بیچ

خار و خس و خاشاک تو جانیں، ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گلِ خوبی ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ

منتِ قاصد کون اٹھائے شکوۂ درباں کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

○

لوگ ہلالِ شام سے بڑھ کر پل میں ماہِ تمام ہوئے
ہم ہر بُرج میں گھٹتے گھٹتے صُبح تلک گمنام ہوئے

اُن لوگوں کی بات کرو جو عشق میں خوش انجام ہوئے
نجد میں قیس یہاں پر انشاؔ خوار ہوئے ناکام ہوئے

کس کا چمکتا چہرا لائیں کس سُورج سے مانگیں دُھوپ
گھور اندھیرا چھا جاتا ہے خلوتِ دل میں شام ہوئے

ایک سے ایک جنوں کا مارا اس بستی میں رہتا ہے
ایک ہمیں ہشیار تھے یارو ایک ہمیں بدنام ہوئے

شوق کی آگ نفس کی گرمی گھٹتے گھٹتے سرد نہ ہو؟
چاہ کی راہ دکھا کر تم تو وقفِ دریچہ و بام ہوئے

اُن سے بہار و باغ کی باتیں کر کے جی کو دُکھانا کیا
جن کو ایک زمانہ گزرا کُنجِ قفس میں رام ہوئے

انشاؔ صاحب پو پھٹتی ہے تارے ڈوبے صُبح ہوئی
بات تمہاری مان کے ہم تو شب بھر بے آرام ہوئے

غزل

(حرفِ بازناں گفتن)

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی
دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند کہاں کی

سر زانو پہ رکھے ہوئے کیا سوچ رہی ہو
کچھ بات سمجھتی ہو محبّت زدگاں کی؟

تم میری طرف دیکھ کے چُپ ہو سی گئی تھیں
وہ ساعتِ خوش وقت نشاط گزراں کی

اِک دن یہ سمجھتے تھے کہ پایانِ تمنّا
اک رات ہے مہتاب کے ایّامِ جواں کی

اب اور ہی اوقات ہے اے جانِ تمنّا
ہم نالہ کشاں، بے گُنہاں، غم زدگاں کی

اِس گھر کی کُھلی چھت پہ چمکتے ہوئے تارو
کہتے ہو کبھی بات وہاں جا کے یہاں کی؟

برگشتہ ہُوا ہم سے یہ مہتاب تو پیارو
بس بات سُنی راہ چلا کاہکشاں کی

اللہ کرے میرؔ کا جنّت میں مکاں ہو
ق
مرحوم نے ہر بات ہماری ہی بیاں کی

پڑھتے ہیں شب و روز اسی شخص کی غزلیں
غزلیں کہ حکایات ہیں ہم دل زدگاں کی

تم چرخِ چہارم کے ستارے ہوئے لوگو
ق
تاراج کرو زندگیاں اہلِ جہاں کی

اچھا ہمیں بنتے ہوئے مٹتے ہوئے دیکھو
ہم موجِ گریزاں ہی سہی آبِ رواں کی

انشاؔ سے ملو اس سے نہ روکیں گے، ولیکن
ق
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں کی؟

مشہور ہے ہر بزم میں اِس شخص کا سودا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں کی

ق اے دوستو اے دوستو اے درد نصیبو!
گلیوں میں چلو سیر کریں شہرِ بُتاں کی

ہم جائیں کسی سمت کسی چوک پہ ٹھہریں
کہیو نہ کوئی بات کسی سود و زیاں کی

ق اِنشاؔ کی غزل سُن لو پہ رنجور نہ ہونا
دیوانہ ہے دیوانے نے اِک بات بیاں کی

ہوتا ہے یہی عشق میں ہنجار سبھی کا
باتیں یہی دیکھی ہیں محبت زدگاں کی

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صُبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکّوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچّا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہے ان بنجاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چُپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

جس جِپسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلا لگا نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گُمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو، دل کا کہنا، وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزّت داروں کا

انشا جی اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

○

پیت کے روگی سب کچھ بُوجھے سب کچھ جانے ہوتے ہیں
اِن لوگوں کے اینٹ نہ مارو کہاں دوانے ہوتے ہیں؟

آہیں اِن کی اُمڈتے بادل آنسو اِن کے ابرِ مطیر
دشت میں اِن کو باغ لگانے شہر بسانے ہوتے ہیں

ہم نہ کہیں گے آپ ہیں پیت کے دُشمن من کے کٹھور مگر
آ ملنے کے نا ملنے کے لاکھ بہانے ہوتے ہیں

اپنے سے پہلے دشت میں رہتے کون سے نہریں لاتے تھے؟
ہم نے بھی عشق کیا ہے لوگو سب افسانے ہوتے ہیں

انشاؔ جی چھبیس برس کے ہو کے یہ باتیں کرتے ہو؟
انشاؔ جی اس عُمر کے لوگ تو بڑے سیانے ہوتے ہیں

خوب ہمارا ساتھ نبھایا، بیچ بھنور کے چھوڑا ہات
ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا نکلے ہو — اچھی بات

شام سے لے کر پو پھٹنے تک کتنی رُتیں بدلتی ہیں
آس کی کلیاں، یاس کی پت جھڑ، صبح کے اشکوں کی برسات

اپنا کام تو سمجھانا ہے اے دل رشتے جوڑ کہ توڑ
ہجر کی راتیں لاکھوں کروڑوں، وصل کے لمحے پانچ کہ سات

ہم سے ہمارا عشق نہ چھینو، حسن کی ہم کو بھیک نہ دو
تم لوگوں کے دُور ٹھکانے، ہم لوگوں کی کیا اوقات

روگ تمہارا اور ہے انشاؔ، بیدوں سے کیوں چھل کرو
درد کے سودے کرنے والے، درد سے پا سکتے ہیں نجات؟

○

اُن کا دعویٰ، اُن کی عدالت اور انہی کی تعزیرات
اُن کا دوست زمانہ سارا، اپنا دوست خدا کی ذات

اے یارو اس فصل میں اپنا جوشِ جنوں رُسوا نہ کرو
گلشن گلشن خاک اُڑتی ہے پھُول نہ غنچے ڈال نہ پات

مہر و مروّت میں وہ ہمارے پتھّر کے بُت اچھے تھے
آئے تھے اب لوٹ چلے ہیں حضرتِ یزداں تسلیمات

آپ ہی آپ پٹے جاتے ہیں اپنے پیادے اپنے فیل
ہم کیوں کھیلیں اس بازی میں ہاتھ ہمارے جیت نہ مات

ہم نے یہ مانا اِک انٹی میں یُوسفِ کنعاں ملتا ہے
وقت کے بوسیدہ چرخے پر اُمیدوں کا سُوت نہ کات

انشاؔ صاحب صُبح ہُوئی ہے اُٹھو بھی اب کوچ کرو
اِس منزل پر قافلے والے رُکتے ہیں بس رات کی رات

○

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رُت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی سی برسات کہاں

چاند نے کیا کیا منزل کر لی — نکلا، چمکا، ڈوب گیا
ہم جو آنکھ جھپک لیں سو لیں اے دل ہم کو رات کہاں

پیت کا کاروبار بہت ہے اب تو اور بھی پھیل چلا
اور جو کام جہاں کے دیکھیں فرصت دیں حالات کہاں

قیس کا نام سُنا ہی ہوگا ہم سے بھی ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل سب کی یہ اوقات کہاں

○

ہم اُن سے اگر مل بیٹھتے ہیں، کیا دوش ہمارا ہوتا ہے
کچھ اپنی جسارت ہوتی ہے، کچھ اُن کا اشارا ہوتا ہے

کٹنے لگیں راتیں آنکھوں میں، دیکھا نہیں پلکوں پر اکثر؟
یا شامِ غریباں کا جگنو، یا صبح کا تارا ہوتا ہے

ہم دل کو لئے ہر دیس پھرے، اس جنس کے گاہک مل نہ سکے
اے بنجارو ہم لوگ چلے۔ ہم کو تو خسارا ہوتا ہے

دفتر سے اُٹھے کیفے میں گئے، کچھ شعر کہے، کچھ کافی پی
پُوچھو جو معاش کا انشا جی یُوں اپنا گزارا ہوتا ہے

○

زمیں پہ سبزہ لہک رہا ہے فلک پہ بادل دھواں دھواں ہے
مگر جو دل کے مزاج پوچھو ہمارے دل کا عجب سماں ہے

درونِ سینہ غمِ جدائی کا داغ ہے اور کہاں کہاں ہے
اگر یہی بختِ عاشقاں ہے فغاں ہے اے دوستو فغاں ہے

خراب دل کی خراب باتیں اُداس دن بے قرار راتیں
جو درد ہے دردِ جانستاں ہے جو سوز ہے سوزِ رائیگاں ہے

میں تیری مانند وسعتِ دہر میں اکیلا سا پھر رہا ہوں
فضائے صحرا کے ابرپارے کہیں پہ منزل کا بھی نشاں ہے

نہ قافلہ چاند کا ہویدا، نہ منزلِ نورِ صبح پیدا
وہی گزرگاہِ کہکشاں ہے، وہی غبارِ ستارگاں ہے

نہ ایسے آنے کی آرزو تھی نہ ایسے جانا ہماری خو تھی
ہمارے دل کی بھی آبرو تھی مگر وہ پہلا سا دل کہاں ہے

تم اس پہ حیراں ہو خوش خیالو، پرانے وقتوں کے نجد والو
وگرنہ ہم کو بھی کچھ گماں ہے، وگرنہ اپنی بھی داستاں ہے

نہ ان کے چہرے کی دھوپ دیکھی نہ ان کے آنچل کی چھاؤں پائی
رُتوں سے محروم جا رہے ہیں عجب نصیبِ بلاکشاں ہے

تم اپنے انشاؔ کی راہ و منزل کو جانتے ہو
وہ تنہا تنہا رواں دواں ہے کہ ہم

○

سانحہ ہم پہ یہ پہلا ہے مری جاں کوئی ؟
ایسے دامن سے ملاتا ہے گریباں کوئی ؟

قیس صاحب کا تو اِس غم میں عجب حال ہُوا
اپنے رستے میں نہ پڑتا ہو بیاباں کوئی

ہم نے اپنے کو بہت دیر سنبھالا ہوتا
آ ہی نکلے اگر آنسو سرِ مژگاں کوئی ؟

یارو اس دردِ محبت کی دوا بتلاؤ
ڈھونڈ لیں گے غمِ دوراں کا تو درماں کوئی

یک نظر دیکھنا، رحم کرنا، ہوا ہو جانا
ن سے چھُوٹی ہے بھلا خوئے غزالاں کوئی ؟

ہم کسی سمت بھی نکلے ہوں وہیں جا نکلیں
ہم سے بھولی ہے رہِ کوچۂ جاناں کوئی؟

اب تری یاد میں روئیں گے نہ حیراں ہوں گے
اُن سے پیماں ہے کوئی، دل سے ہے پیماں کوئی

سُونی راتوں میں سرِ بسترِ خوابِ راحت
بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی

بھیگی شاموں میں کھُلے صحن میں تنہا تنہا
بیقرارانہ بھی دیکھا ہے خراماں کوئی

دوستو دوستو اس شخص کو جا کر سمجھاؤ
اپنے انشاؔ کے سنبھلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی ہم لوگوں کی وحشت پہ ہنسا کرتا تھا
آیا اس خانۂ ویراں میں بھی مہماں کوئی

○

یُوں تو ہے وحشت جزوِ طبیعت، ربط نہیں کم لوگوں سے
اب تو برس دن بعد بھی انشؔا ملتے نہیں ہم لوگوں سے

کیوں تجھے ضد ہے وضع نبھائیں، چاند نہ دیکھیں عید کریں
چھُپ نہ سکے گا اے دلِ بریاں دیدۂ پُرنم لوگوں سے

کیا ہُوا خشت اُٹھا دے ماری یا سرِ دامن نوچ لیا
تم تو دوانے اس کے بہانے ہو چلے برہم لوگوں سے

عشق کریں تو جنوں کی تہمت، دُور رہیں تو تُو ناراض
اب یہ بتا ہم تجھ سے نبھائیں یا دلِ محرم لوگوں سے

○

ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں کل اور نگر میں صبح کہاں اور شام کہاں

ہم سے بھی پیت کی بات کرو کچھ ہم سے بھی لوگو پیار کرو
تم تو پشیماں ہو بھی سکو گے ہم کو یہاں پہ دوام کہاں

سانجھ سمے کچھ تارے نکلے پل بھر چمکے ڈوب گئے
انبر انبر ڈھونڈ رہا ہے اب انہیں ماہِ تمام کہاں

دل پہ جو بیتے سہ لیتے ہیں اپنی زباں میں کہ لیتے ہیں
انشاؔ جی ہم لوگ کہاں اور میرؔ کا رنگِ کلام کہاں

ہمیں تم پہ گمانِ وحشت تھا ہم لوگوں کو رُسوا کیا تم نے
ابھی فصل گلوں کی نہیں گزری، کیوں دامنِ چاک سیا تم نے

اس شہر کے لوگ بڑے ہی سخی، بڑا مان کریں درویشوں کا
پر تم سے تو اتنے برہم ہیں، کیا آن کے مانگ لیا تم نے

کن راہوں سے ہو کر آئی ہو، کس گل کا سندیسہ لائی ہو
ہم باغ میں خوش خوش بیٹھے تھے کیا کر دیا آ کے صبا تم نے

غمِ عشق میں کاری دوا نہ دُعا، یہ ہے روگ کٹھن یہ ہے درد بُرا
ہم کرتے جو اپنے سے ہو سکتا، کبھی ہم سے بھی کچھ نہ کہا تم نے

وہ جو قیس غریب تھے ان کا جنوں سبھی کہتے ہیں ہم سے رہا ہے فزوں
ہمیں دیکھ کے ہنس تو دیا تم نے، کبھی دیکھے ہیں اہلِ وفا تم نے؟

اب رہروِ ماندہ سے کچھ نہ کہو، یونہی شاد رہو آباد رہو
بڑی دیر سے یاد کیا تم نے، بڑی دُور سے دی ہے صدا تم نے

اک بات کہیں گے انشا جی تمہیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہان کا علم پڑھے، کوئی میر سا شعر کہا تم نے؟

○

جنگل جنگل شوق سے گھومو، دشت کی سیر مدام کرو
انشاؔ جی، ہم پاس بھی لیکن رات کی رات قیام کرو

اشکوں سے اپنے دل کی حکایت دامن پر ارقام کرو
عشق میں جب یہی کام ہے یارو لے کے خدا کا نام کرو

کب سے کھڑے ہیں بر میں خراجِ عشق لئے سرِ راہگذار
ایک نظر سے سادہ رخو، ہم سادہ دلوں کو غلام کرو

دل کی متاع تو لوٹ رہے ہو، حسن کی دی ہے زکات کبھی؟
روزِ حساب قریب ہے لوگو، کچھ تو ثواب کا کام کرو

میرؔ سے بیعت کی ہے تو انشاؔ میرؔ کی تبعت بھی ہے ضرور
شام کو رو رو صبح کرو اب، صبح کو رو رو شام کرو

○

دل کس کے تصوّر میں جانے راتوں کو پریشاں ہوتا ہے
یہ حسنِ طلب کی بات نہیں، ہوتا ہے مری جاں ہوتا ہے

ہم تیری سکھائی منطق سے اپنے کو تو سمجھا لیتے ہیں
اک خار کھٹکتا رہتا ہے سینے میں، جو پنہاں ہوتا ہے

پھر ان کی گلی میں پہنچے گا، پھر سہو کا سجدہ کر لے گا
اس دل پہ بھروسا کون کرے، ہر روز مسلماں ہوتا ہے

وہ درد کہ اس نے چھین لیا، وہ درد کہ اس کی بخشش تھا
تنہائی کی راتوں میں انشاؔ اب بھی مرا مہماں ہوتا ہے

○

دل کا تھا چاک مگر پہنچایا، تا بہ گریباں انشاؔ نے
دشت میں جا اِک شہر بسایا بے سر و ساماں انشاؔ نے

قیس کی سنّت نجدِ وفا میں پھر اس شخص نے زندہ کی
ہم کو بھی پہلے تقیں نہیں آیا انشاؔ نے ہاں انشاؔ نے

پھر کوئی یاد پُرانی جاگی، پھر کسی درد نے چُٹکی لی
پھر ہمیں دیوانے نے بُلایا چلتے ہیں یاراں (انشاؔ نے)

ایک سے ایک انوکھا دیکھا دُنیا میں غم تو ہزاروں تھے
کیوں تجھے تنہا جی میں بسایا اے غمِ جاناں انشاؔ نے

اہلاً و سہلاً تیرے جلو میں آتا ہے جو کچھ آنے دے
عشق کو ہے اب ڈھال بنایا گردشِ دوراں انشاؔ نے

دل کے سنبھلنے کی کوئی صورت لازم ہے یہاں کچھ بھی نہیں
اپنے کو جب سے یہ روگ لگایا کر لیا حیراں انشاؔ نے

اب اے دُنیا وحشی و رسوا خوار و پریشاں کچھ بھی کہے
عشق کیا اور کر کے نبھایا عشق کے شایاں انشاؔ نے

○

پیت کرنا تو ہم سے نبھانا سجن، ہم نے پہلے ہی دن تھا کہا نا سجن
تم ہی مجبور ہو، ہم ہی مختار ہیں، خیر مانا سجن یہ بھی مانا سجن

اب جو ہونے کے قصے سبھی ہو چکے، تم ہمیں کھو چکے ہم تمہیں کھو چکے
آگے دل کی نہ باتوں میں آنا سجن، کہ یہ دل ہے سدا کا دوانا سجن

یہ بھی سچ ہے نہ کچھ بات جی کی بنی، سُونی راتوں میں دیکھا کیے چاندنی
پر یہ سودا ہے ہم کو پُرانا سجن، اور جینے کا اپنے بہانا سجن!

شہر کے لوگ اچھے ہیں ہمدرد ہیں، پر ہماری سنو، ہم جہاں گرد ہیں
داغِ دل نہ کسی کو دکھانا سجن، یہ زمانا نہیں وہ زمانا سجن

اس کو مدت ہُوئی صبر کرتے ہُوئے، آج کوئے وفا سے گزرتے ہُوئے
پُوچھ کر اس گدا کا ٹھکانا سجن، اپنے انشا کو بھی دیکھ آنا سجن

کبھی ان کے ملن کی آشا نے اک جوت جگا دی تھی من میں
اب من کا اُجالا سنولایا، پھر شام ہے من کے آنگن میں

جی گھلتا ہے آنسو ڈھلتے ہیں ہر نیر میں دیپک جلتے ہیں
اِس برکھا سے جی کی آگ بجھے یہ تو اور بھی بھڑکے ساون میں

چلو انشا کے پاس چلیں بیٹھیں سنیں گیت منوہر پریم بھرے
جنہیں سن لیں تو من کو مسوس مریں سبھی گوپیاں گوکل کے بن میں

یہ چھیل چھبیلا کون پھرے اس متھرا کی نگری میں سکھیو
سبھی باتیں کہ اپنے شیام میں تھیں اب دیکھ لو اس منموہن میں

سبھی بول مدھر سبھی نین سجل، کن گلیوں میں تم ہمیں لے آئے
اس من کو نہ لوگو بھٹکاؤ، یہ من ہے کسی کے بندھن میں

ہر شکل کا رُوپ نہیں ہوتا، ہر رُوپ کو نام نہیں دیتے
کچھ شکلیں ہیں اپنی آنکھوں میں کچھ رُوپ ہیں من کے درپن میں

کبھی من کے اجنتا میں آؤ، وہ مورتیں تم کو دکھلائیں
وہ صورتیں تم کو دکھلائیں، ہم کھو گئے جن کے درشن میں

ہر ایک پہ نظریں اٹھنی تھیں، ہر ایک پہ جی کو مچلنا تھا
اِس شہر میں رُوپ کا کال نہیں، کچھ اور ہے اپنے ساجن میں

یا بن میں چکارے ملتے ہیں، یا پیت کے مارے ملتے ہیں
کچھ پورب میں کچھ پچھم میں، کچھ اُتّر میں کچھ دکّھن میں

شہروں میں پھرے سنیاس لئے جنتا کو جگت بھگوان کہے
انشا سا کوئی رمتا دیکھا؟ کہنے کو ہیں جوگی ھر بن میں

کس واسطے ٹھیٹ بنے رہیئے، ذرا رنگ بدل کے غزل کہیئے
یہ جو اُردو زبان ہماری ہے سو رنگ ہیں اس کے دامن میں

اُس حُسن کے نام پہ یاد آئے سب منظر فیض کی نظموں کے
وہی رنگِ حنا، وہی بندِ قبا، وہی پھول کھلے پیراہن میں

کچھ وہ جنہیں ہم سے نسبت تھی اِن کوچوں میں آن آباد ہوئے
کچھ عرش پہ تارے کہلائے، کچھ پھول بنے جا گلشن میں

ہم لوگوں کے آنے سے پہلے بھی تم لوگ ادھر سے گزرتے تھے
کبھی پھول بھی دیکھے غرفوں میں؟ کبھی قوسِ قزح کسی چلمن میں؟

یوں کرنے کو عشق پہ قید نہیں، سب کرتے ہیں اچھا کرتے ہیں
پر ہم سے بہت بھی نہیں گزرے — کچھ لوگ تھے منفرد اُن میں

ہم ان سے جو دل کو دُور رہے، کچھ خوش ہوئے، کچھ رنجور ہوئے
اب دل کا ٹھکانا مشکل ہے ہاں جان رہے گی ایمن میں

تم لوگوں نے چاند بجھا ڈالا، شبِ ماہ کا لطف گنوا ڈالا
اب لاکھ چراغ جلاتے پھرو، ہر راستے پر ہر روزن میں
کبھی میرؔ فقیر کی بیتوں سے، کبھی غزلوں سے انشاؔ صاحب کی
اِن برہ کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں من میں

طویل نظمیں

بغداد کی ایک رات

سند باد آج تو ہمراہ مجھے بھی لے چل
دل جو بہلا تو خیالوں ہی میں اپنا بہلا
میں ترے ساتھ زمانے کی نظر سے اوجھل
لے کے چلتا ہوں خیالوں کا سفینہ اپنا
جا ہی نکلیں گے کسی شہر میں ہم آج نہ کل

شور و غل شہر کا مدھم ہوا، پھر ڈوب گیا
آج بستی سے بہت دُور نکل آیا ہوں
ظلمتِ شام نے دُھندلا دیے دشت و دریا
سوچتا ہوں کہ سرائے کو ابھی لوٹ چلوں

یا اسی ساحتِ ویراں کے کسی گوشے میں
سرد بالو کو بنائے ہوئے بستر اپنا
آج کی رات گزاروں کہیں بیٹھے بیٹھے
شہر و صحرا میں مسافر کے لیے فرق ہی کیا؟

○

خواب آلود ہے دجلہ کے سواحل کا جہاں
پھیلے جاتے ہیں پُراسرار دُھندلکے ہر سو
خنکیاں وسعتِ صحرا میں ہوئیں بال فشاں
سوندھی سوندھی سی یہ آتی ہے کہاں سے خوشبو

سطحِ دجلہ پہ گفہ[1] کوئی مَحیلہ[2] کوئی
شام کی دُھند میں لپٹا ہوا ہولے ہولے
شہر کی سمت بڑھا جاتا ہے لیکن چپ چاپ
جیسے خاموشیِ صحرا سے اُلجھنے سے ڈرے

پرلے ساحل پہ مچھیروں کی کسی بستی میں
جاگتے جاتے ہیں مٹی کے تنک تاب دیے
کوئی دم جاگ کے تھک جائیں گے، سو جائیں گے
کون اس رات کو پایانِ سحر تک پہنچائے

---

[1] و [2] گفہ یا قفہ ایک گول کشتی ہے جو ہزاروں برس سے دجلہ میں چلتی آئی ہے۔ محیلہ لمبی اور نوکیلی ہوتی ہے۔

زرد رُو چاند تھکے ہارے مسافر کی طرح
منزلِ دُور کی راہوں کے تصوّر سے اداس
مطلعِ شرق سے ابھرا ہے پریشاں حیراں
دشتِ ویراں میں کھجوروں کے کسی جھنڈ کے پاس

اور کسی مرقدِ بشکستہ کے گنبد میں کہیں
دوش و امروز کی گردش کا ستایا ہُوا بُوم
آلِ برمک بنی عبّاس کے نوحے گاتا
یک بیک کس لیے چُپ ہوگیا، کس کو معلوم

اک عجب کیفیتِ خواب مسلّط ہے یہاں
شورِ ماتم ہے کسی سمت نہ شادی کا خروش
اپنی دنیائے کشاکش کو میسّر ہیں کہاں
خنکیِ شام میں بھیگے ہوئے لمحاتِ خموش

دن مشقّت میں کٹیں، راتیں ستارے گنتے
صبحیں آئیں غمِ تازہ کے سندیسے لے کر
رُوح بے مہریِ اوقات کا محور ہی رہے
جانے کب تک ہے یہی سلسلۂ شام و سحر

شاہزادوں ہی کی جاگیر ہیں سارے انعام
اپنی قسمت ہے فقط خار کشی، محرُومی
کچھ اسی دَور میں دیکھا ہے یہ رنگِ ایّام
زندگی پہلے زمانوں میں تو دشوار نہ تھی

ہائے کیا دن تھے، میسّر تھا ہر انساں کو فراغ
لوگ با شوکتِ شاہانہ جیا کرتے تھے
سب کی جیبوں میں ہُوا کرتے تھے جادو کے چراغ
جِن سبھی کام سرانجام دیا کرتے تھے

حکم ملتے ہی بنا دیتے تھے بگڑی ہوئی بات
عیش جاوید میں آنے نہیں پاتا تھا خلل
لا کے پہلو میں بچھا دیتے تھے محبوب کی سیج
رات کی رات میں چن دیتے تھے مرمر کے محل

خضر و الیاس خلاؤں سے ٹپک پڑتے تھے
آیا کرتا تھا کڑا وقت کسی پر جو کبھی
جی میں آئی تو ہوئے دیدۂ حیراں سے الوپ
سیر کی شہپرِ شہ رخ پہ زمانے بھر کی

پیٹ بھوکا تھا کوئی اور نہ برہنہ کوئی جسم
کس کو مزدوری و محنت کی پریشانی تھی
قاضیِ ایں ہمہ حاجات تھا سم سم کا طلسم
باد آورد خزانوں کی فراوانی تھی

ہم نے دیکھا ہے مچھیروں نے جو ڈالا کبھی جال
دجلہ سے عہدِ سلیماں کے خزینے نکلے
اپنی تقدیر پہ کورا نہ بھروسے کے طفیل
کتنے حبّال[1] سرِ بامِ امارت پہنچے

دیکھتے دیکھتے افلاس لکڑہاروں کا
شوکت و شانِ وزارت میں بدل جاتا تھا
اسمِ اعظم کی کرامت تھی جہانگیر ایسی
سایۂ ادبار کا اک آن میں ٹل جاتا تھا

شہر میں آئے گجر دم جو مسافر کوئی
لوگ اسے شہر کا سلطان بنا لیتے تھے
تاج رکھتے تھے سرِ فرق بصد عجز و نیاز
اپنا آقا بہ دل و جان بنا لیتے تھے

---

[1] حسن حبّال (حسن رسن ساز) کا قصہ الف لیلہ کے مشہور قصّوں میں سے ہے۔ اس کی ایک پیسے کی پونجی محض خوبیٔ طالع سے لاکھوں میں بدل جاتی ہے۔

بادشہ زادیاں قدموں میں بچھی رہتی تھیں
دور از دست نہ تھے قاف کی حُوروں کے پرے
اپنے محلوں میں چُھپا لیتی تھیں لاکر پریاں
ابنِ آدم جو اکیلے میں کہیں مل جائے

اپنا یہ عالمِ بے رنگ بھی عالم ہے کوئی؛
آؤ کچھ دیر انہی خوابوں کے جزیروں میں چلیں
ڈھونڈیں بغدادِ کہن سال کی گلیوں میں سکوں
ارضِ افسانہ پہ جادو کے کھٹولے میں اڑیں

۲

کتنی شب بیت گئی دجلہ کی ساکن موجو
آدھی بجتی ہے کہ ہے پچھلے پہر کا ہنگام
کشتِ انجم سے گزرتا ہوا مغرب کی طرف
منزلیں طے کیے جاتا ہے مہِ سُست خرام

چادرِ خواب میں لپٹا ہے جہانِ موجُود
الف لیلہ کے فسانوں کا جہاں ہے آباد
شہرِ رُومان کے ہنگاموں کا عالم ہے وہی
پھر وہی شورِ خلائق ہے بسوق و بازار

پھر انہی رندوں کے جھرمٹ ہیں خرابات کے گرد
کہنہ حجروں میں کھنکتے ہیں وہی جام و سُبو
قصرِ شاہی کے جھروکوں میں پریشاں ہیں ادھر
ماہ رخسار کنیزوں کے گھنیرے گیسُو

شورِ نغمہ ہے زبیدہ کے شبستاں میں بند
عود و عنبر کا تعطّر ہے فضا میں ساری
سُونے ایوانوں میں پائل کے چھناکے گونجے
چھم چھما چھم ، چھما چھم ، رقص ہُوا ہے جاری

لو کوئی غیرتِ ناہید قیامت بردوش
اپنا سرمایۂ اعجاز سمیٹے آئی
(ساز بیدار ہوئے جھانجھ نے پہلو بدلے)
اور مغنّی نے غزل دھیمے سُروں میں چھیڑی

غ

اے دل اندیشۂ آلام نہ کر آج کی رات
ان کی چتون کے اشارے ہیں ادھر آج کی رات

دیکھنا ہے شبِ عشرت کی نہایت کیا ہے
بزم اٹھتی ہے کہ ہوتی ہے سحر آج کی رات

ایسے عالم میں قیامت کا نہ چھیڑو مذکور
قدرِ ایمان سمجھتے ہیں مگر آج کی رات

زاہدو جام پیو ، خُلد کی حسرت چھوڑو
ساقیو اِن پہ بھی احساں کی نظر آج کی رات

دِل کو برماؤ ستاروں پہ کمندیں ڈالو
رقص فرماؤ باندازِ دگر آج کی رات

رُک گئی گیت کی لے ، تھم گئی پائل کی چھنک
رقصِ پیمانہ و مینا کی ہوئی تیاری

اِک طرف غرق مے ناب ہوئے ظِل اللہ
مایۂ ہوش اُدھر ہار گئے درباری

○

اور ڈیوڑھی پہ کھڑا ایکِ غلامِ زنگی،
اپنی دنیائے تصوّر میں کہیں کھویا گیا
آہیں بھرنے لگا اُمڈے ہوئے آنسو روکے
بیٹھے بیٹھے اسے کیا جانیے کیا یاد آیا

اس کے خوابوں کی سیہ چہرہ پری رہتی ہے
ارضِ تاریکِ حبش کی کسی وادی میں کہیں
اڑ کے جائے اسے سینے سے لگالے لیکن
آج اِک جنسِ تجارت ہے یہ انساں تو نہیں

○

یہ بھی دنیا ہے وہی، آؤ کہیں اور چلیں،
آئے تھے ہم تو اسی درد سے ڈرتے بچتے
سِسکیاں گیت کی لے سے ہیں گلوگیر یہاں
گرم اشکوں میں شرابور ہیں رعنا چہرے

کون بیٹھا ہے وہ دیکھیں تو سرِ راہ گزر
ہے اِسی شہر کا باسی، کہ مسافر کوئی
اپنے وعدے کو نبھائے گی کوئی مہرنگار
کس کی رہ دیکھ رہا ہے ذرا پوچھیں تو سہی

بوالحسن نام کا اپنا یہ وہی دوست نہ ہو
آ نِکلتا تھا جو ہر شام سرِ راہ گزار
جستجو دل میں کسی اجنبی مہماں کی لیے
اس کی یہ وضع معیّن تھی خزاں ہو کہ بہار

بھیس میں تاجرِ موصل کے خلیفہ ہارُوں
ایک شب اِس کے شبستاں میں جو آکر ٹھہرا
کھا کے یک روزہ خلافت کا فریبِ سیمیں
یہ بچارا کسی محبس میں نظر آیا تھا

○

دیکھنا ظلِّ الٰہی کی سواری آئی
راستہ چھوڑو کہ سلطانِ جہاں آتے ہیں
ساتھ لشکر ہے ندیموں کا خراماں بہ ادب
سر پہ طاؤس و ہما سایہ کناں آتے ہیں

دھول مٹی میں سَنے کیڑو مکوڑو رستہ
بندگی پیشہ غلاموں کے گروہو چھٹ جاؤ
اپنی منحوس جبینوں کو چھپالو فوراً
شاہِ دوراں کی نگاہوں سے پرے ہٹ جاؤ

○

دور وادی میں نظر آتی ہے اونچے اونچے
سبز پریوں کے محلّات کی دُھندلی سی قطار
آؤ کچھ دیر وہیں چل کے ذرا سستالیں
کچھ تو ہو خاطرِ درماندہ کو سامانِ قرار

شہرِ مسحور نہ پڑتا ہو مگر رستے میں
جس کے بازار ہیں خاموش بہائم سے پٹے
ایک دن یہ سبھی انسان تھے مگر آج نہیں
کس میں ہمّت ہے کہ اس سحرِ گراں کو توڑے

کتنے مہ پاروں کے جھرمٹ ہیں حرم کی رونق
سجتے ہیں چاند سے جسموں پہ مرصّع گہنے
جمع ہیں خدمتِ اقدس میں نوادر کیا کیا
ظلِّ سبحانی کی سطوت کے تو پھر کیا کہنے

چیخ کس کی یہ سرِ بامِ فلک جا پہنچی
کون برسوں کی تمنّا سے لپٹ کر رو دیا
پہلوئے شاہ میں کس کس کا جگر گوشہ ہے
کتنی کٹیائیں اُجڑ کر حرم آباد ہُوا

درد خوابیدہ کی ٹیسیں بھی تو جاگ اُٹھتی ہیں
عشرتِ رُوح کا ساماں نظر آتا ہے جہاں
ایک کانٹا بھی تو چُبھ جاتا ہے چپکے سے کہیں
پھول نکہت بگریباں نظر آتا ہے جہاں

شہرِ رُومان پہ چھایا ہے وہی رنگِ ملال
جس سے انساں کو مفر عالمِ امکاں میں نہیں
سند باد آئے، مگر سختیِ طوفاں کے ستائے
تسمہ پاؤں کی اسیری میں دل افگار و غمیں

○

کس کی محفل میں یہ لے آئی ہے اب کے افتاد
بزمِ ہاروں تو نہیں حاجبِ در سے پوچھیں
ہر کوئی اٹھ کے سُناتا ہے کہانی اپنی
ہم بھی اس حلقے میں چل کے ذرا بیٹھیں دیکھیں

"ظلِّ سُبحانی ترا مرتبہ قائم دائم"
تجھ کو اللہ سلیمان کا منصب بخشے
میں بھی اس شہر کے بازاروں میں نوواردہُوں
میری باری ہے تو میری بھی حکایت سُن لے

میں کسی شہر کا تاجر ہوں نہ والی نہ وزیر
نہ کسی شاہِ معاصر کا جگر گوشہ ہوں
نہ کسی بادشہ زادی کی محبّت کا اسیر
سر میں سودائے ریاست، نہ امارت کا جنوں

میں ہُوں دہقان جو کھیتوں میں اگاتا ہے اناج
فصل پکنے پہ سمجھتا ہے کہ محنت برآئی
یہ مگر تیرا، کہیں تیرے پیادوں کا خراج
میں جو کھلیان سے دامن لیے اٹھّا خالی

آج مزدُور ہوں اک تیل کے مِل کا مزدُور
اور اُس جہدِ شب و روز سے پایا کیا ہے
خود تہی دست ہوں، خواجہ کے خزانے بھرپور
اب میں یہ پوچھنے آیا ہوں۔ یہ دنیا کیا ہے؟

کیا مجھے پرچمِ کاوہ[1] لیے آنا ہوگا
کیا تبھی ہوش میں آئے گی خلافت تیری
کیوں تری بزم ہوئی جاتی ہے درہم برہم
ظلِّ سُبحانی مری بات تو سُن لی ہوتی"

○

نرم بالُو کا بچھونا ہے خنک اور مرطُوب
چاند مغرب میں بہت دُور کہیں جا پہنچا
سطحِ دجلہ پہ گفہ ہے نہ محیلہ کوئی
نوحہ خواں بُوم بھی مدّت ہوئی خاموش ہُوا

---

[1] ایرانی آہنگر زادہ جس نے اپنی دھونکنی کے پرچم تلے عوام کا لشکر جمع کیا اور ضحاک سے زور آور غاصب کو شکست دی۔

گھنٹیاں بجتی ہیں، گرد اڑتی ہے، شور اٹھتا ہے
کارواں موصل و شیراز کے آتے ہوں گے
مشہد و یزد و صفاہاں کے امیروں کے سفیر
تحفے ہر ملک کے ہر دیس کے لاتے ہوں گے

یا ھلاکو کے عساکر کا ہراول ہوگا
جس نے تسخیرِ ممالک کے عزائم لے کر
آج بغداد کے ایوانوں کو تاکا ہوگا
اب کوئی دم میں ہوا جاتا ہے سب زیر و زبر

کیا مگر اس سے بدل جائیں گے اپنے ایام؟
ہوں، وہ مستعصم و ہاروں کہ ہلاکو کوئی
جب تک اس نہج پہ چلتا ہے زمانے کا نظام
کون کہتا ہے بدل سکتی ہے قسمت اپنی

کوئی موہُوم سی اُس آس پہ کب تک جی لے
ٹھہرو اب کوئی فرستادۂ غیب آئے گا
آکے توڑے گا وہ افلاس کے، غم کے بندھن
پر جو مہدی کی بجائے وہ ھلاکو نکلا

ابنِ آدم کا جہاں —— دردِ ازل کا محور
قیدِ غم سے کبھی آزاد بھی ہوگا کہ نہیں
حسرتیں دل میں پلے جائیں گی کب تک آخر
یہ خرابہ کبھی آباد بھی ہوگا کہ نہیں؟

۳

اب تو لو پَو بھی پھٹی ۔ نُور کا تڑکا بھی ہُوا
(اور میں اب تک یہیں بیٹھا ہوں، یہ عالم کیا ہے؟)
رات کے آخری تاروں کا وداعِ خاموش
صبحِ تازہ کی ولادت کا پتا دیتا ہے

اور کسی پاس کی بستی میں مؤذّن کوئی
اہلِ ایماں کو بلاتا ہے جماعت کے لیے
اس کی آواز کا یہ سحرِ ترنّم ، یہ گداز
دل سے کہتا ہے یہاں سے نہ اٹھاؤ ڈیرے

دُور اِک ریل کے انجن کی پریشاں سیٹی
چیخ اٹھی ہے کہ تعطیل کے دن ختم ہوئے
آج ہی رختِ سفر باندھ کے جانا ہوگا
منتظر بیٹھے ہیں کرکوک[1] میں افسر میرے

پھر وہی سر بفلک دود کشوں کی دنیا
پھر وہی تیل کے چشموں کی فضائے بُودار
پھر وہی سلسلۂ جہدِ گراں، مزدِ قلیل
اور وہی محل میں خواجہ کے طلا کے انبار

اور یہ خواجہ کہیں افرنگی، کہیں امریکی
جس کی صد رنگ سیاست کا طلسم سیمیں
تسمہ پا بن کے ہے مشرق کی فضاؤں پہ سوار
کب تک اس سحر کا معمول رہے گی یہ زمیں

---

[1] کرکوک عراق میں تیل کا مشہور مرکز۔ بغداد اور موصل کے درمیان واقع ہے۔

شہر زادوں کے تخیّل کا وہ بغداد کہاں
نفت و روغن کی سیاست ہے فضاؤں میں رچی
بھیس میں تیل کے تاجر کے نکل آتا ہے
اب بھی بغداد کی گلیوں میں خلیفہ کوئی

کوئی اس تاجرِ معصوم کے حیلے دیکھے
صاحبِ خانہ بنا جاتا ہے کل کا مہماں
چام کے دام چلاتے ہیں اجارے اس کے
نام ہاروں کا ہو، فیصل کا ہو زیبِ عنواں

○

اب بخارا و سمرقند کی راہوں سے کبھی
بہرِ یلغار نہ آئیں گے ہلاکو کے مغول
آج کی دنیا ہے لارنس[1] و گلب[2] کی دنیا
آج تسخیرِ ممالک کے ہیں کچھ اور اصول

---

[1] کرنل لارنس [2] اردن کا انگریز سپہ سالار

ابروئے سام[۳] کا ادنیٰ سا اشارہ ہو اگر
قومیں بک جاتی ہیں اور تخت الٹ جاتے ہیں
عظمتِ دہلی و ایتھنز تو افسانہ ہوئی
ہند و یونان اسی حاتم کا دیا کھاتے ہیں

بصرہ و موصل و بغداد ہیں اس کی جاگیر
روم و مصر اس کے ہیں نجد اس کا ہے شام اس کا ہے
اس کے سکّے کے طفیل ایک جہاں میں آشوب
آج بغداد کا ہارُوں بھی غلام اس کا ہے

حرفِ ڈالر کی کرامت ہے کچھ ایسی بلوان
حرفِ سم سم کا فسوں گرد ہوا جاتا ہے
کچّے دھاگے میں بندھی آتی ہیں سرکاریں سبھی
تیل دھرتی کی ہر اک نس سے کھنچا آتا ہے

۳ے انکل سام

۴

سیلِ انوارِ سحر پھیل چلا ہر جانب
آخرِ شب کے دھندلکوں کا فسوں بھی ٹوٹا
اب تو بہتر ہے کہ بستی کی طرف لوٹ چلوں
آج ہی رختِ سفر باندھ کے جانا جو ہُوا

دل کے اُلجھے ہوئے احوال کو سلجھا نہ سکے
شہرِ ہاروں کے یہ پُر پیچ مسقّف بازار
میں سرائے سے جو نکلا تو پھرا سُوق بسُوق
پھر بھی چھایا رہا جی پر وہی بے نام غبار

قہوہ خانے میں جو پل بھر کے لیے جا بیٹھیں
آ نکلتا ہے اِک آوارہ گداؤں کا ہجوم
گونج اٹھتا ہے اِک آوازۂ شَیْئًا لِلّٰہ[1]
گھول دیتا ہے جو ہر جرعۂ قہوہ میں زقوم

شہر و صحرا میں چلے جائے گی کب تک یہی بھوک
عام کب ہوں گے الہ دین کے جادُو کے چراغ
کوئی شہزادہ نہ لائے گا کوئی ردِّ طلسم؟
کوئی اِنساں کو بتائے گا کوئی راہِ فراغ؟

○

اب بخارا و سمرقند کی راہوں سے نسیم
لایا کرتی ہے دمِ صبح بہاروں کے پیام
اور ہر پھول سے کہ جاتی ہے چپکے چپکے
تم بھی چاہو تو بدل سکتے ہو گلشن کا نظام

---

[1] شَیْئًا لِلّٰہ: کوئی شے دو خدا کے لیے۔ بغداد کے گداگروں کا عام نعرہ

تم کو آدم کے مقدر کے جگانے کے لیے
بابل و نینوہ کے ساحر نہ بُلانے ہوں گے
مصر و بغداد کی بگڑی کے بنانے کے لیے
مصر و بغداد کے جمہُور جگانے ہوں گے

ورنہ کچھ سوچ کے بھرتا ہی رہے گا آہیں
شاہی ڈیوڑھی پہ سیہ بخت غلامِ زنگی
اور ہر موڑ پہ آوازۂ شیئاً لِلّٰہ
ہر مسافر کے تعاقب میں رہے گا یونہی

۱۹۴۹ء

شنگھائی

(ذیل کا نوٹ مئی ۱۹۴۹ء میں نظم کی پہلی اشاعت کے ساتھ چھپا تھا)

شنگھائی جو چین کا سب سے بڑا تجارتی مرکز اور دُنیا کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اپنی شبینہ عشرت گاہوں اور کلبوں کے لئے مشہور ہے۔ لیکن انھی کلبوں کے دروازوں کے آگے شنگھائی کے فٹ پاتھوں پر ہر سال اوسطاً تیس ہزار انسان بھوک اور سردی سے جان دے دیتے ہیں۔ شنگھائی میں مزدوروں کو بارہ سے سولہ گھنٹے تک روزانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کی بدحالی دُنیا بھر میں ضرب المثل ہے۔ مزدوروں کے ہڑتال کرنے اور کرانے کی سزا عموماً موت ہے۔ شنگھائی میں قدم قدم پر بدہئیت مائیں، زرد رُو اور نزار بچوں کو گٹھڑیوں کی صورت میں پیٹھ پر ڈالے اپنے استخوانی ہاتھ پھیلائے صدا لگاتی دکھائی دیتی ہیں "کم شا مسٹر نو چو چو" (بابا ایک پیسہ دے جاؤ) ماں صدا لگاتی ہے اور پیٹھ پر جکڑا ہوا بچہ اسے دہراتا ہے۔ آگے چلئے تو ہزاروں لوگ گروہ در گروہ دیواروں کے ساتھ دبکے اپنے سر گھٹنوں میں دیئے پیلی پیلی بے جان آنکھیں نکالے زبان بے زبانی سے بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں اور موہوم اُمید میں آسمان کی طرف نظریں اٹھائے موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

اس شہر کی بین الاقوامی بستی میں جو غیر مُلکیوں کا مرکز تھا، ایک زمانے میں ایک باغ (بند گارڈن) کے دروازے پر یہ بورڈ آویزاں تھا:

DOGS AND CHINESE NOT ALLOWED

شام کے گھرئے سائے پھر پیغام اُداسی کا لے آئے
درد جو دل میں جاگ اُٹھے پھر دل بہلے کِس کے بہلائے
ہوٹل کی چھت پر لیٹا ہوں، جانے کیا کیا سوچ رہا ہوں
کروٹ کروٹ بات وہی ہے، نیند کسی پہلو بھی نہ آئے
دیس پرایا، دوست نہ بیلی، حالِ غمِ دل کس سے کہوں میں
کون سمندر چیر کے آئے، میری لگی کو آ کے بجھائے

پائیں باغ کے گرجا کے گھڑیال میں گیارہ بج بھی چکے ہیں
بازاروں کا شور و شغب بھی لمحہ بہ لمحہ تھمتا جائے
دریا کی پہنائی میں اک اسٹیمر کی سیٹی گونجے
کِس کو خبر ہے کِس منزل کو جاتے ہے اور کِس کو بُلائے

چاند نے بھی پورب کے جھروکے میں اپنا مُکھ دکھلایا ہے
چاند سے باتیں کون کرے جب درد ہی دل میں اُمڈا آئے

ہوٹل اب سنسان ہوا جاتا ہے مسافر سونے چلے ہیں
مجھ کو مگر اِس بستر کی ایک ایک شکن ڈسنے کو آئے
بین الاقوامی بستی میں چہل پہل اب تک ہو شاید
اور کہیں اِس دل کو بھی اپنے درد کا درماں مل ہی جائے
نُڑکے دیکھ مرے بستر کو دھیان میں رکھنا چوکس رہنا
سیر کا یہ بھی وقت ہے کوئی سوچ کے لڑکا بھی مسکائے

شنگھائی کے پیلے پیلے سربفلک تاجر محلوں سے
بچتا بچاتا کہیں کہیں ساگر کی ہوا کا جھونکا آئے
بین الاقوامی بستی کی عشرت گاہیں جاگ رہی ہیں
نغمے کی اک موج کبھی تھم جائے کبھی طوفاں ہو جائے
سینماؤں کے دروازوں سے افرنگی جوڑے نکلے ہیں
ہاتھ کمر میں، پلکیں بوجھل، شانوں پر زُلفیں بکھرائے

ایک کا یا بارہ کا عمل ہے
آج کی پکچر لمبی تھی
آؤ بھی مادام آؤ بھی
ایسے میں گھر کیا جاؤ گی
آدھی رات تو بیت چکی

میڈونا ہوٹل میں چلیں گے
رِکشا او چینی کے بچے
رکشا لا !

آج بہت پی لی ہے جانی
قدم قدم پر بہک رہی ہو
آؤ ذرا اور قریب آجاؤ
آدھی رات تو بیت چکی

ٹک ٹک دیکھ رہا ہے کیسے
او چینی اور عربی بچے
رکشا لا !

رکشا والا مریل پلاٹ فارم تک کس کو دیکھ رہا ہے
تاجر کو جو مہماں بن کر آئے اور آقا بن جائے
رکشا قلی کو یاد ہیں شاید اب تک وہی پرانی باتیں
کیسے اک پچھم کا بیوپاری کاندھے پر بکس اٹھائے
چین دیس میں آیا تھا اور میٹھی بولی بول رہا تھا
میٹھی بولی جیسے کوئی بات بات میں شہد ملائے

اے چینی، اے بھائی چینی!
لے چینی افیون تو کھا!

تیرے ودوانوں کے آگے — دُنیا بھر کا سر نیچا
تیرے بنا ساری دُنیا میں — چوپٹ اندھیارا ہوتا

ہم تو نرے بیوپاری ٹھہرے — ہم کو کسی سے کیا لینا
اک کوٹھی کی جگہ دلا دے — لے چینی افیون تو کھا!

۲

میڈونا ہوٹل کے اندر لوگوں کا میلہ سا لگا ہے
ساغر کھنکیں، کاگ اُڑے بوتل کا اور مستی چھا جائے
بال رُوم کے دُھندلے دُھندلے شیشوں میں سے جھانک رہے ہیں
سینہ بہ سینہ، چہرہ بہ چہرہ، مٹیالے مٹیالے سائے
ایک میز پر ایک البیلا بنکی بیٹھا ڈینگیں مارے
ایک طرف اِک بڈھا ٹامی بیتے دنوں کی بات سُنائے

اِس بستی کا بچہ بچہ ہم لوگوں کو سجدہ کرے تھا
اِس بستی میں ہم لوگوں نے لاکھوں کیا اربوں ہی کمائے
بند گارڈن کے دروازے پر یہ بورڈ لگا رہتا تھا
"کوئی بھی چینی کوئی بھی کُتّا باغ کے اندر آنے نہ پائے"
آج مگر اسکولوں کے لڑکے بھی ہمارے مُنہ آتے ہیں
کوئی مری سب دولت لے لے! بیتے دنوں کو واپس لائے'

میڈونا ہوٹل کے باہر لوگوں کا میلہ سا لگا ہے
بھک منگوں کے غول کھڑے ہیں ہاتھوں کو کشکول بنائے
ایک طرف پٹڑی کے نیچے ننگی بھوکی روگی مائیں
اُونگھ رہی ہیں اندھی بہری دیواروں سے ٹیک لگائے
سڑکوں کے ایک ایک موڑ پر ننّھے بچے بڈھے چینی
چیخ رہے ہیں دانت نکوسے "کوئی سخی پیسہ دے جائے"

میڈونا ہوٹل کے باہر شنگھائی کے فٹ پاتھوں پر
آئے برس جاڑے کے دنوں میں پالا اُترے جھکڑ آئے
کال کے مارے ننگے بھوکے تیس ہزار انسان ایسے ہیں
مرجائیں چپکے ہی چپکے۔ بھاگ کا لکھا کون مٹائے
صاحب شور مچا دیتے ہیں، بُو سے ناک پھٹی جاتی ہے
کونسل والے چیخ اٹھتے ہیں، اتنی لاشیں کون اٹھائے

---

* شنگھائی کی میونسپل کونسل نے واقعی معذوری کا اظہار کیا تھا۔

۳

رات بھی دن بھی شپ شپ شپ پہیے چالیس رولر گھومیں
شنگھائی کی فیکٹریوں کی ماشینوں کو نیند نہ آئے
چھن چھن چھن چھن سونے کے سکّے بنک میں جاکر گرتے جائیں
مالک کی ٹھوڑی پہ ہمیشہ ایک نئی تہ چڑھتی جائے
چہرے کی رونق بڑھتی جائے، روز نئی تدبیریں سوجھیں
اب کے برس کچھ چال چلیں ایسی کہ منافع چوکھا آئے

فیکٹریوں میں شپ شپ شپ پہیے چالیس رَولر گھومیں
سولہ گھنٹے کام کرے مزدور پلک جھپکا نا پائے
چھن چھن چھن چھن سونے کے سکّے بنک کے تھیلے بھرتے جائیں
چھ آنے کا پانے والا بات کرے اور گولی کھائے
کہیں کہیں پر دبی دبی فریادوں کا اک مدھم ریلا
ماشینوں کے شور سے یکدم اُبھرے اور بِھرتا جائے

ایک آواز:

اے ساتھی یہ جالم ڈیوٹی — روج کریں پر چین نہ پائیں
کس سے اپنا حال کہیں ہم — کس کو اپنا درد سنائیں
کھون پسینے فرق نہ سمجھیں — بھاری بھرکم ملیں چلائیں
پھر بھی ہمیشہ دل میں یہ دبدھا — کل کیا پہنیں، کل کیا کھائیں
پیٹ پہ پتھر باندھ کے سوئیں — فٹ پاتھوں پر عمر بتائیں

دوسری آواز:

ایک ہمیں پڑت نہیں ساتھی — ایک ہمیں دکھیارے نہیں ہیں
اور بہت ساتھی ہیں ہمارے — ہم اتنے بیچارے نہیں ہیں
ہم دھرتی کا پوٹا چیریں — کولا لوہا بھر بھر لائیں
رکشا کھینچیں، ریشم کاتیں — نہریں کھودیں، محل بنائیں
ہم کھیتی کو پانی دیویں — ہم کھیتی سے ان اپجائیں

پہلی آواز:

ہم کھیتی کو پانی دیویں — ہم کھیتی سے ان اپجائیں
پھر کیوں اتنے سنکٹ جھیلیں — بھوک سے چھٹکارا نا پائیں

پورب، پچھم، اتّر دکھن　　آگے پیچھے دائیں بائیں
کال کے راچھس چارکوٹ ہیں　　گِدھوں کی صُورت منڈلائیں

دُوسری آواز:

اے ساتھی یہ بات نہ چھیڑو　　بات کریں تو جیب کٹائیں

پہلی آواز:

ٹک ٹک بیٹھے کب تک لیکن　　یہ انیائے دیکھے جائیں
یہ جلّاد حکومت والے　　ہمرا پہنیں، ہمرا کھائیں
ہمرے ساتھی ملک بدر ہوں　　ہمرے ساتھی جیل میں جائیں
ہمرے نیتا پھانسی لٹکیں　　ہمرے نیتا گولی کھائیں

(دونوں آوازیں مل جاتی ہیں۔ پھر بیسیوں آوازیں، پھر سینکڑوں)

کل جو ہوا ہے اب نہیں ہوگا
فیکٹریوں سے نکلو آؤ
رکشا موڑو، ریلیں چھوڑو
بسیں گراجوں میں پہنچاؤ

اے دفتر کے بابُو نکلو
پوتھی کو دریا میں بہاؤ
پڑھنا لکھنا کل پر چھوڑو
اسکولوں کے لڑکو آؤ
آج یہ بیری جانے نہ پائیں
گھیرا ڈالو ہاتھ دکھاؤ
کونگ سونگ کو گولی مارو
چیانگ کو پھانسی پر لٹکاؤ
ماؤ کی فوجیں کتنی دُور ہیں
ماؤ کی فوجوں کو بلواؤ

ماؤ کی فوجوں کو بلواؤ!

۴

شنگھائی کے اسٹیشن پر بندرگہ پر بھیڑ لگی ہے
دیکھیں کب اسٹیمر چھوٹے کب دکھن کو گاڑی جائے
سڑکیں وہی ہیں اور سڑکوں کے موڑ وہی پر رفتہ رفتہ
اِک شنگھائی دم توڑے اور اک شنگھائی اُبھر آئے

ایک ایک انسان کے دل میں آگ کی لاٹیں جاگ رہی ہیں
ان لاٹوں کو کون دبائے، اس جوالا کو کون بجھائے

یہ ریلا تو رُک نہ سکے گا، یہ موجیں تو تھم نہ سکیں گی
ینسی کا طوفانِ خروشاں بڑھتا آئے چڑھتا آئے
نوبت باجے، قرنا پھونکیں ماؤ کے دہقان گوریلے
ان کی لگن کو کون خریدے ان کی قیمت کون چکائے
میدان ان کے پاؤں کی مٹی، جنگل ان کو گھاس کے تنکے
دریا نالے حکم کے بندے، پربت ان کو سیس نوائے

شنگھائی میں، کلکتے میں لوگوں کو پیغام سنا دو،
بھوک سے ننگے فٹ پاتھوں پر اب کوئی مرنے نا پائے
سائیگون میں کولمبو میں سب کے دل میں جوت جگا دو
رونے کے دن بیت چلے اب کوئی نہ دکھیا نیر بہائے
رات جہاں بلوان ہو اب تک، آشاؤں کے دیپ جلا دو
اُجلے دنوں کی دھندلی ریکھا اندھیاروں میں ڈوب نہ جائے

۱۹۴۹ء

مضافات

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

۱

ان سے وعدہ ہے کہ اک نظمِ حسیں لکھوں گا
اپنی محبوبۂ بے نام کی زُلفوں سے طویل
اپنے مجبُور ارادوں سے زیادہ بے باک
اپنی خاکسترِ افسردہ کے شعلوں کی دلیل
جیسے برسات کی راتوں میں لپکتا کوندا
چیر دیتا ہے گھٹا ٹوپ سیاہی کی فصیل

آج اس نظم کی تکمیل کا سودا لے کر
پھر مضافات کے کھیتوں میں نکل آیا ہوں
ریل کے پُل کی سلاخوں کا سہارا لے کر
سوچتا ہوں کہ سرِ راہ یہیں دم لے لوں
دُور وہ دُھند کا بادل ہے، کہ گاڑی کا دُھواں
اور وہ نظم جو لکھنی ہے، مگر کیا لکھوں؟

اپنے یاروں سے جُدا ہو کے یہ عالم ہے کہ آج
دل نہیں قحط کا اُجڑا ہوا ویرانہ ہے
اب ہیں بے مہریٔ جاناں ہی کی باتیں باقی
اب فقط برہمیٔ زُلف کا افسانہ ہے
اب نہ بغداد کی اس رات کی یاد آتی ہے
اور نہ شنگھائی پہ یلغارِ حریفانہ ہے

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو،

پھول دامن سے لپٹتے تھے تعطّر بکنار
خار بے تاب تھے ہر راہ میں بچھ جانے کو
اور اک دوست سرِ طنز پکار اُٹھا تھا
'کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو'

اور میں ایک سے اک راہ میں افتاں خیزاں
کتنے امصار و ولایات سے ہوتا ہوتا
کتنے ہمرنگِ زمیں داموں سے بچتا بچتا
لکۂ ابرِ گریزاں سرِ دشت و صحرا
شہرِ خوباں کے جھروکوں کا تصور باندھے
ایک دن ایسی ہی اک شام یہاں آنکلا

۲

کتنا خوش تھا کہ اب اُس شہر کو چھوڑ آیا ہوں
جس میں آزادہ روی جُرم گِنی جاتی ہے

صبحِ تازہ کو ہے افسردہ شعاعوں پہ غرور
رات بے نور ستاروں کی قسم کھاتی ہے
عشقِ سادہ کو جہاں رشتہ بپا رکھتے ہیں
عقلِ گستاخ کہیں راہ نہیں پاتی ہے

اب یہاں بیٹھ کے لکھیں گے محبت بھرے گیت،
میرے شاعر نے کہ دل میں تھا مقیّد بیٹھا
پھر اسی غمزۂ مانوس سے انگڑائی لی
پھر انہی ملگجے اوراق کا دفتر کھولا
اور پھر کلکِ گہر بار کے اوپر جھک کر
ایک مسجودِ خیالی سے یہی عرض کیا:

میں ترے مصر میں بک جاؤں سرِ راہگذر
میں ترے مصر کے بازاروں میں رسوا ہو جاؤں
تیرے اشراف مجھے توشۂ ارزاں سمجھیں
میں ترے شہر میں نذرِ غمِ دنیا ہو جاؤں

مجھ کو ناکردہ گناہی کی سزا بھی منظور

کیا ہے اک بار جو معتوبِ زلیخا ہو جاؤں

اب مگر جانبِ کنعاں نہ قدم اُٹھیں گے

مجھ کو معلوم ہے معمورۂ کنعاں کیا ہے؟

مجھ سے پوشیدہ نہیں خاکِ وطن کی قیمت

معنیٔ خار و خس و سُنبل و ریحاں کیا ہے

کتنی بے مہر ہوا کرتی ہیں گھر کی یادیں

زیست میں مرحلۂ شامِ غریباں کیا ہے

میں غمِ شامِ غریباں کا گلہ مند نہیں

زہر لگتے ہیں وطن کے در و دیوار مجھے

جانے کیا سوچ کے جنّت سے نکل آیا ہوں

تہمتِ گندم و حوّا سے ہے انکار مجھے

میری سرگشتگیِ عشق پہ جائے نہ کوئی

رسن و دار کا سمجھے نہ سزاوار مجھے'

لیکن اس شہر کے کوچے بھی وہی کوچے ہیں
یہ نیا شہر خیالوں کا نیا شہر کہاں
ایک کانٹا ہے کہ سینے میں کھٹکتا ہے ہنوز
اک چھلاوا ہے کہیں ذہن کی قبروں میں نہاں
پھر کوئی منزلِ دشوار بُلاتی ہے مجھے
دل کی وحشت کا ٹھکانا تو یہاں ہے نہ وہاں

ان سے وعدہ ہے کہ اک نظمِ حسیں لکھوں گا
لیکن افکارِ حسیں ذہن میں آتے ہی نہیں
تا قلم آکے پھسل جاتا ہے کیا کیا مصرع
سنگلاخ اتنی بھی ہوتی نہیں شعروں کی زمیں
شوق کہتا ہے کوئی دم تو اٹھالو یہ حصار
عقل کہتی ہے وہی دشت نہ قسمت ہو کہیں

اور ادھر کوچہ و بازار کی پہنائی میں
جانے کیا شور ہے — یہ شورِ قیامت ہی نہ ہو

عقل کہتی ہے دریچوں کے گرادو پردے،
شوق کہتا ہے۔ نہیں، دل کو ٹٹولو، اٹھو،
میں اسی برج میں رہتا ہوں مرا نام یہ ہے
دوستو کس کو بلاتے ہو، کہو کچھ تو کہو،

اس گھٹاٹوپ اندھیرے سے بچائے گا کوئی؟
گل ہوئی جاتی ہیں اس برج کی ساری شمعیں
کیا ہوئے محفلِ انصاف و دیانت کے مغاں
آج ہم دل کی حکایت جو کہیں کس سے کہیں
اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجیں گے
تاکہ گھبرائیں تو ٹکرا بھی سکیں، مر بھی سکیں،

مالرو معتمدِ حلقۂ دیگال ہے آج
سارتر کا مہِ نخشب ہے سرِ شام غروب
آج لہمیں کا تکیہ ہے مزاجِ یورپ
اور آڈن کو فقط روحِ مسیحی محبوب

اِشَروُڈ آج رشی یوگ کے سادھن سیکھے

کل کا ناخوب سپینڈر کی نظر میں ہوا خوب

۴

وقت کے ساتھ مفادات بدل جاتے ہیں

ورنہ اب بھی وہی تقدیرِ جہاں ہے کہ جو تھی

آج پھر جنگ کے بادل ہیں فضاؤں پہ محیط

دل پہ کلچر کے سپاہی کی سناں ہے کہ جو تھی

فاشیت تازہ عزائم کو لئے اُٹھی ہے

امن و انصاف کی آواز کہاں ہے کہ جو تھی

مَیڈرِڈ اب بھی ہمہ وقت لہُو روتا ہے

وادیاں بارسلونا کی ہیں زنداں اب تک

جن میں سوتے ہیں بریگیڈ کے جانباز اپنے

قرطبہ کے وہ نواحات ہیں ویراں اب تک

ان کی قبروں پہ صلیبیں نہ کوئی لوحِ مزار

یہ مسافر ہیں رقیبِ سرو ساماں اب تک

سحر ٹوٹا نہیں بابل کے خداوندوں کا
کتنے فرعون خراماں ہیں سرِ ساحلِ نیل
کتنے روما ہیں شہنشاہیٔ نیرو میں نزار
پمپیائی ہیں بہیمانہ تماشوں کے قتیل
جس کے گھاؤ کی تراوش سے سمندر ہوئے سُرخ
اب بھی یونان کے سینے میں ترازو ہے وہ کیل

وار سا ہے کہ سنبھلنے بھی نہیں پایا ہے
خُون اب تک ہے بڑا پسٹ[1] کے سینے سے رواں
اب بھی دلگیر ہے دیروز کی یادوں سے پراگ
اور مغرب کی طرف تکتا ہے حیراں حیراں
فاختہ لائے گی پیغامِ کرسمس کہ عقاب؟
کونسی شے ہے سراپردۂ مغرب میں نہاں

کشتِ دہقان کو روندیں گے دبابے آکر
گولیاں ڈھلتی ہیں گمنام سپاہی کے لئے

---

[1] ٹینک

سر پہ طیاروں کی گھمکار سنائی دے گی
دشت و کہسار پہ چھا جائیں گے فوجوں کے پرے
جیسے محبس سے نکل آئیں سلیمان کے جن
جیسے پنڈورا کے صندوق کا کھٹکا کھل جائے

۵

ان سے وعدہ ہے کہ اک نظمِ حسیں لکھوں گا
پر یہ کس سمت سے آنے لگی بارود کی بو
کوریا دور ہے، اتنا بھی مگر دور نہیں
کھیت اجڑتے ہیں، زمیں پھنکتی ہے، بہتا ہے لہو
جسمِ نازک سے گزر جاتا ہے جلتا سیسہ
ٹوٹ جاتا ہے بیک ضرب جوانی کا سبو

کانٹا چبھتا ہے تو رگ رگ کی خبر لاتا ہے
ایک کی مرگ سے ہوتا ہے زمانہ غمگیں

جنگ ہوتی ہے تو سنگینیں بھی چبھتی ہیں ضرور
مرنے والوں کا شمار، ایک نہیں سو بھی نہیں
کوئی بیٹا ہے کہ پیارا ہے کہ بھائی ہے کہ باپ
دکھ تو ہے جس سے ہوا جاتا ہے میداں رنگیں،

اور میں سوچتا ہوں، امن کے ہونے تک ہیں
زندگی کے سبھی ساماں، غمِ جاناں کے سمیت
میرا کالج، مری سیریں، مرے شاعر، مرے گیت
میرے غنچے، مری بیلیں، مرے خرمن، مرے کھیت
میرے چہرے، مرے سپنے، مری راتیں، مرے چاند
میری وادی مرے دریا مرے ساحل مری ریت

پھر تو جے کاروں کے ٹکراؤ سے دہلے گی زمیں
پیس ڈالیں گے نئی پود کو ٹینکوں کے خراس
یادگاروں میں بنائیں گے منارے کبھی گیٹ
آپ وہ لوگ نظر آئیں گے پھر دور نہ پاس

ایک اک گھر میں جو سیلابِ بلا اُمڈے گا
اس کو روکیں گے نہ انعام نہ تمغے نہ کراس

میں تو چینی ہوں نہ یِنکی ہوں نہ کالا ہوں نہ لال
بس یُونہی سیر کو کھیتوں میں نکل آیا ہوں
امن اک حرفِ سیاست ہے کہ کچھ اور بھی ہے
یہ سمجھ میں کہیں آجائے تو آگے بھی چلوں
دُور وہ گیس کا بادل ہے کہ توپوں کا دُھواں
اور وہ نظم جو لکھنی ہے — مگر کیا لکھوں؟

۱۹۵۱ء

امن کا آخری دِن

آج کیوں شام کے اخبار کی ہر سُرخی میں
ایک اِک لفظ بُنے جاتا ہے اُلجھے ہوئے جال
وسوسے اُمڈے چلے آتے ہیں بادل بادل
کلبلاتے ہیں پڑے ذہن کے گوشوں میں خیال
اب تو ہر سطر سے آنے لگی بارود کی بُو
اب تو ہر صفحے سے بے کھٹکے گزرنا ہے محال

بہرِ شبخون بڑھے آتے ہیں یادوں کے ہجوم
دیکھیں کیا حال بنے صُبح کے ہوتے ہوتے
اتنی سوچیں ہیں کہ پہلے کبھی سوچی ہی نہ تھیں
اتنے چہرے ہیں کہ پہلے کبھی دیکھے ہی نہ تھے

اب تو کابوس کی صورت ہیں رگ و پے پہ محیط
شام تک وہ جو بھی نقش تھے دھندلے دھندلے

الف آندھی ہے کہ مغرب سے اٹھا چاہتی ہے
الف امید چراغِ تہِ داماں ہے ابھی
الف ایٹم ہے بآغوشِ ہزاراں آشوب
الف آدم کہ بہ غم چاک گریباں ہے ابھی
الف اِک امن کہ جاں دی تھی تو پایا تھا اسے
الف اک اشک کہ مژگاں پہ فروزاں ہے ابھی

ب وہ بندوق کہ اِک روز کہیں سر ہو گی
ب وہ بمباروں کا جھرمٹ ہے کہ بڑھتا آئے
کبھی دہقاں کے گھروندے پہ تو خرمن پہ کبھی
بے اماں برق کا کوندا ہی پڑا لہرائے
قریے قریے سے لپکتی ہوئی لاٹیں اٹھیں
بستی بستی کو شراروں سے جھلستا جائے

پ ہے پنشن کہ سپاہی کو شجاعت کے عوض
ایک پہلو میں ٹھمکتی سی بساکھی دے جائے
پ وہ پلٹن ہے کہ اڑ کر سرِ میدان پہنچی
پ وہ پیارے ہیں کہ میداں سے نہ واپس آئے
ٹ وہ تمغہ ہے کہ برسوں کی ریاضت سے ملے
اور کسی لاش کی چھاتی پہ چمکتا رہ جائے

ٹ کسی باغِ جوانی کی لچکتی ٹہنی
بم کے اُڑتے ہوئے ٹکڑوں سے ہے پارا پارا
بوڑھے ماں باپ کی برسوں کی دُعاؤں کا ثمر
ٹ کسی اجنبی میدان میں دم توڑ گیا
لوٹتے قدموں سے گونجے گی نہ گھر کی دہلیز
آپ کا لختِ جگر مُلک پہ قربان ہوا

ج وہ جنگ کا بازار ہے جس میں جا کر
اتنی صدیوں میں بھی انسان کی قیمت نہ بڑھی

چ وہ چاندی ہے وہ چاندی کے چمکتے سکّے
جن سے دُنیا کی ہر اک چیز خریدی نہ گئی
پھر بھی ہر بیس برس بعد وہی سودے ہیں
وہی تاجر ہیں وہی جنس ہے قیمت بھی وہی

ح حکایت ہے کہ ہونٹوں پہ ادھوری رہ جائے
ح وہ حسرت ہے کہ سینے کو بنا لے مدفن
خ خیالات کا ریلا ہے کہ یکسر رُک جائے
دب کے رہ جائے جو خندق کے خلاؤں میں بدن
ٹینک کر دیں گے ہر اک ڈھیر کو آ کر ہموار
بے نشاں قبروں پہ اُگ آئیں گے دو سال میں بن

د ہے درد سے لبریز دلوں کی دھرتی
ڈ ہے ڈولتا سینہ کبھی ڈھلکا آنسو
ذ ہے ذِکر کسی دوست کا وہ ذکرِ جمیل
ہائے کن رفتہ بہاروں کے گلوں کی خوشبو

آج لاشوں کے تعفّن میں دبی جاتی ہے
سرد سنگینوں کے زخموں سے اُبلتا ہے لہو

نہ وہی ریل کی سیٹی وہی رعنا چہرا
نہ وہی رات وہی اُس کے بھیانک سپنے
چونک کر کون یہ بستر سے یکایک اٹھا
"میرے بچّے کو خداوند سلامت رکھے"
ایک تارا کہیں ٹوٹا تھا کہیں ڈوب گیا
ڈاکیا آئے گا دو روز میں اِک تار لئے

نہ ہے وہ زہر کہ پھر رُوح میں گھُل جائے گا
نہ ہے وہ زخم کہ لاتا ہے خبر دل تک کی
اب بھی بستی میں بڑے پیر کا میلہ ہوگا
لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں بہار آئے گی
پر نہ ان راہوں سے لوٹے گا بنسی والا
اب چراگاہ میں گونجیں گی نہ تانیں اس کی

سَ سہرا کسی دولہا کا کسی سیج کے پھول
سَ جلتا ہوا سینہ کسی سنگین کی دھار
سَ ساحر ہیں سیاست کے کہ گھر میں بیٹھے
اپنے زانو پہ لئے صبح کے سارے اخبار
سوچا کرتے ہیں یہ پڑھتے ہوئے تازہ خبریں
روئی کے بھاؤ میں ہوتا ہے چڑھاؤ کہ اُتار

اُپنے اس شہر سے ہیں دُور وہ میداں جن میں
شَ شعلہ ہے کہ بارُود کا سینہ چاٹے
کسی مسجد کا منارہ، کسی اسکول کی چھت
اک دھماکے میں سُلگتا ہوا ملبہ بن جائے
کوئی کھیتی کوئی کرخانہ کوئی پُل کوئی ریل
ایک دُنیا ہے کہ برسوں میں بنائے نہ بنے

صَ وہ صبح کہ ہر ذہن کی پہنائی میں
لاکے بو دیتی ہے نادیدہ صلیبوں کی قطار

ضؔ خبروں کے ضمیموں کا وہ اُگلا ہوا زہر

جس سے کچھ اور ہی بڑھ جاتا ہے وحشت کا فشار

ناچنے لگتے ہیں بے تابی سے فہرستوں کے نام

آنکھیں بن جاتی ہیں رُوکے ہوئے اشکوں کے مزار

طؔ طبروق کا صحرا ہے جہاں سے اب بھی

اپنے گم گشتہ عزیزوں کی صدا آتی ہے

اِس جگہ فتح کی خبریں ہیں نہ جلسے نہ جلوس

ایک صرصر ہے کہ آتی ہے گزر جاتی ہے

استخوانوں سے بھلا کِس کو محبّت ہوگی

یاں کوئی دوست نہ ہمدم نہ ملاقاتی ہے،

ظؔ ظلمات کا دریا ہے کہ طوفان بدوش

اُس کی ننّھی سی کشتی کو ڈبونے آئے

اور جب ظُلم کی میعاد کے دن اور بڑھیں

عؔ وہ عشرتِ فردا ہے کہ عنقا ہو جائے

غ وہ غم ہے کہ جاناں سے نہ دوراں سے ہے خاص
دل مگر اس کی کسک سے نہ سنبھلنے پائے

ف ہے وہ فتح کہ چھلے تو گئی ڈے نہ بکی
ف ہے فردا کہ چھلاوے کا چھلاوا ہی رہا
ق قریہ ہے کہ اتنا بھی نہ ویراں تھا کبھی
اب نہ چولھوں سے دھواں اٹھتا ہے نیلا نیلا
اور نہ وہ کھیت نہ وہ فصلیں نہ وہ رکھوالے
ایک اک گاؤں کے چوپال میں اُلّو بولا

ک نینوں کے کمل کہ کتابی چہرے
ک کاکل ہے کہ خوشبو میں بسی رہتی تھی
اور جب دور کے دیسوں کے سپاہی آئے
ک کرگس نے کھلے کھیت یہ بازی جیتی
کو ریا کتنے خرابوں کا پتا دیتا ہے
یہ جگہ شہر تھی یہ گاؤں تھا یہ بستی تھی

گ گاتی ہوئی گولی ہے کہ گن سے نکلے
کسی گمنام سپاہی کا نشانہ باندھے
ایک سایہ کسی کھائی میں تڑپتا رہ جائے
اپنی برسوں کی تمناؤں کو سینے میں لئے
گ گبرو ہے کہ بائیس بہاروں میں پلے
ل لاشہ ہے کہ دو روز کے اندر سڑ جائے

م محبوب کا آغوش بھی ہے موت بھی ہے
ایک ہی وقت میں ممکن نہیں دونو سے نبھاؤ
ن ندی کا مدھر نغمہ بھی نیپام بھی ہے
اب اِسے دوست بناؤ کہ اُسے دوست بناؤ
زلیست اور موت میں مشکل نہیں جانبداری
سیدھی باتوں کو دلیلوں کے لبادے نہ پنھاؤ

و ہے وقت کہ ہاتھوں سے ہے نکلا جاتا
واہمے دیتے ہیں آگر درِ دل پر دستک
فاختہ کتنی بھی طیّار و سُبک سیر سہی
سینکڑوں کوس ہیں بمبار کی رفتار تلک

امن کے گیت کی لے تیز کرو تیز کرو
ساحلِ دور سے آنے لگی توپوں کی دھمک

ہ وہ ہیرو ہیں کہ پھر نکلے ہیں چھیلے بن کر
بستی بستی کو ہیروشیما بنانے کے لئے
ی وہ یادیں ہیں کہ دُھندلائیں نہ مٹنے پائیں
اور ہم جنگ کی دہلیز پہ پھر آ نکلے
ی وہ یوسف کہ خدا کو بھی نہ سونپے جائیں
پھر انہی اجنبی میدانوں کا رستہ لیں گے

آسماں تیرہ و تاریک ہے، تارے مغموم
چاند بادل سے نکلتے ہوئے گھبراتا ہے
شمعِ اُمید کی لَو کانپ رہی ہے کب سے
دل دُھواں دھار گھٹاؤں میں دبا جاتا ہے
لو کسی دُور کے گرجا میں وہ گھڑیال بجا
قافلہ صُبح کا آتا ہے ــــ کہاں آتا ہے؟

۱۹۵۲ء

اُفتاد

'کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اُکھڑ جاتی ہے'

'اختر الایمان'

۱

نگاہوں کی دُوری کی دُشوار منزل میں تم آج سے دُور تر ہو گئے ہو
شبِ ہجر کی اوّلیں منزلوں سے گریزاں مثالِ سحر ہو گئے ہو
تمہیں زیست کے موڑ پر آ کے ملنے کے وعدے کی میعاد تو آ چکی ہے
مگر اب تو کچھ پاؤں تھک سے چلے دُور کی بات ہے شام دُھندلا چکی ہے
وہ اُتّر کے مُلکوں سے کونجیں رُپہلی مسلسل مسلسل چلی آ رہی ہیں
وہ پچھّم سے اُمڈے اندھیرے کی پرچھائیاں سرمئی پنکھ پھیلا رہی ہیں

وہ پورب میں ممیاتی بھیڑوں کے گلّے کے باڑے کے پہلو میں ہکا الاؤ
مگر کالے کوسوں کی دشوار منزل کہے جا رہی ہے ابھی لوٹ جاؤ

سُبک چاند نے سرمئی شام کی بھاری چلمن کو سرکا کے چہرا دکھایا
اُداسی کے گرداب کے دائرے اور گہرے ہوئے جانے کیا یاد آیا
فضاؤں میں کچھ جانی پہچانی شکلیں، ہیولوں کی صورت کہیں تیر آئیں
کسی نے سرِ صبح ڈیوڑھی پہ آکر گئی شب کی ناشاد خبریں سنائیں
بایں چاکِ داماں بھی کنعاں کے یوسف بنِ بے گناہی کی کیا کیا نہ لائے
مگر قلعۂ مصر کے اونچے برجوں کو زنہار زنہار جھکنا نہ آئے
یہ ہالی کے بیلوں کی جوڑی کے گھنگرو جھنا جھن جھنا جھن بجے جا رہے ہیں
کہ یادوں کی ویران راہوں سے پھر دوستوں کے وہی قافلے آرہے ہیں

شبِ ماہ میں گھومتے گھامتے شعر سنتے سناتے سحر کرنے والے
وہ سرمست و آوارہ احباب اپنے وہ سپنوں کے لوبھی امنگوں کے پالے
کسی ساحلِ بحرِ ذخّار کی سیپیاں چُنتے چُنتے کہاں کھو گئے ہیں
کہ اُن کی جبینوں کے روشن چراغوں کی یادوں کے شعلے بھی مدھم ہوئے ہیں

اُڑے اُونچے اُونچے حرموں کے اُوپر سے پرواز کرتے پرندوں کی ڈارو
سُنو تو سہی کوئی دم کو ہمیں ساتھ لے جاؤ ان دوستوں میں اتارو
مگر گاؤں کے جھونپڑوں کا دھواں جس میں رنگِ شفق تھوڑا سنولا رہا ہے
نگاہوں کی دُوری کے پردے کی مانند دیوارِ محکم بنا جا رہا ہے

۲

مرے دل کے روشن جھروکے سے جھانکا ہے پھر ایک معصوم و شاداب چہرا
تصوّر مجھے تیرے مہجور جلووں کا خاموش پیغام دیتا رہے گا
اسے اپنی وحشت کی افتاد سمجھیں کہ پندارِ مجبُور کی بے نیازی
بہت دن بساطِ جہاں پر رہے پر یہ نردیں نہ چھوٹیں یہ کھیل نہ بازی
رفیقوں نے اپنے مصافِ جہاں میں ولایات جیتی ہیں میدان مارے
مگر ہم تو ان سے بچھڑ کے لڑائی کے پہلے ہی میداں میں اپنے سے ہارے
کوئی آشنا آشنا سی خلش پھر بھی مجبُور کرتی ہے۔ بولو نہ بولو
کہیں سے بوئے دوست آنے لگی ہے ذرا من کی ڈیوڑھی کی کنڈی تو کھولو

بہت روز کی بات ہے سرد راتوں میں اندھے چراغوں کے سایوں میں لیٹے
کتابوں کے قصوں کے جنوں سے دُنیا زمانے کے اسرار پوچھے تھے ہم نے
سنا تھا ہماری ہی رہ تک رہی ہیں تُجھتر کی پریاں سر اپنے سنوارے
مگر کوئی اپنے بُلائے نہ بولا بہت نام لے لے کے ہم تو پُکارے
کسی خضر فرخندہ صورت نے ہم کو نہ زنبیل بخشی نہ جادو سکھایا
ہمیں تو زمانے کے کوہِ ندا سے یہی ایک پیغام سننے میں آیا
"نہ سینے سے آہوں کے بادل اُٹھاؤ، نہ آنکھوں سے اشکوں کے خوشے اُگاؤ
جو محنت کرو اس کی اُجرت بھی مانگو جو کھیتی کو جوتا ہے روٹی بھی کھاؤ"

مگر آنے والے زمانے کے مرلن[1] جو آئے تو با صد کرامات آئے
پُرانے صحیفوں کے احکامِ عشرہ کو منسوخ کر کے نئے حکم لائے
کتابوں کے پیچیدہ لفظوں کا جادو بھی دھرتی کے بیٹوں کے سر چڑھ کے بولا
نئے ہادیوں نے نئے منبروں سے نئے آدمی پر نیا بھید کھولا
'سرِ طاقِ' چرخِ چہارم کے اُوپر' دبیر ازل کے نوشتے دھرے ہیں
کہ جن میں بشر کے مقدر کے اعراب اور قاف تک مرتسم ہو چکے ہیں

---

[1] کنگ آرتھر کے دربار کا جادوگر جس کا کردار ولن کا کردار ہے۔

جو چھوٹا ہے تحقیق چھوٹا رہے گا، بڑے ہی کے مقسوم میں ہے بڑائی
یہ کاوش ہے باغی ابوذر فسادی یہ مزدک ہے کافر یہ لینن قسائی"

۳

اُجالے کے منّاد سُورج کی رفتار تاروں سے یا کہکشاں سے چھپی ہے
تو پھر آج کی شام کیوں آنے والے سویرے کے دُعدوں کو بھولی ہوئی ہے
اُجالے اندھیرے کے طنّاز تاگے طلسمات کیا کیا بُنے جا رہے ہیں
نئے بندی خانوں کی باڑوں کے کانٹوں میں وحشی خیالوں کو اُلجھا رہے ہیں
یونہی شب کے پہلے پہر کے مسافر بہر گام تازہ غزل گانے والے!
سَلاسِل کے لوہے کی سنگیں صلابت کو شبستاں پہ پگھلانے والے!
زمانے نے گیلی غلاموں[۱] سے اب تک ہزاروں برس فاصلہ طے کیا ہے
ہر اک گام پر یہ مسافر نے دیکھا کوئی بیسٹیل[۲] راہ روکے کھڑا ہے

زمیں زادگاں پر زمیں زادگاں نے کبھی تیر چھوڑا کبھی دام پھینکا
کبھی شہر و قریہ کو بلسن[۳] بنایا، کبھی کشت و گلشن پہ نیپام پھینکا

---

۱ GALLEY SLAVES ۲ BASTILLE فرانس کا مشہور قید خانہ جو انقلابِ فرانس میں ٹوٹا
۳ نازیوں کا مشہور بندی کیمپ

کبھی اپنے طرّار بمبار بھیجے، کبھی اپنی جرّار فوجیں بڑھائیں
کبھی ٹینک در ٹینک چڑھ آئے ظالم مگر ایسے حق بات رکتی ہے سائیں؟
کسی نے کہا اب اُڑن چھتریوں سے قلم کے جیالے سپاہی اتارو
چلو چل کے مطلب کے میدان دیکھو، چلو چھپ کے ذہنوں پہ شبخون مارو
فسانے بنو یہ نیا آدمی غاصبوں کے ہے کھیل کھیلنے کا بہانا
کسی نے بہائم کے باڑے[۴] کا باسی کسی نے خداوندِ[۵] ناکام جانا

نیا آدمی بوڑھے آدم کا بیٹا کہاں تک بھلا خُود کو حیران کرتا
سرِ بامِ چرخِ چہارم بھی پہنچا سرِ بالِ جبریل طیران کرتا
اسیرِ ازل نے دبیرِ ازل کے نوشتوں کی محفوظ تحریر بدلی
یہ بے باک و گُستاخ و کافر تو ٹھہرا مگر ارضِ اسفل کی تقدیر بدلی
کبھی ہوانگ ہو کے خروشاں بہاؤ کے تسخیر کرنے کو پُشتے بنائے
کبھی آمو دریا کی پہنائی چیرے تو دشتوں کو فصلوں کے مُژدے سنائے
ہلوں کی مشینوں کے جائے یہ مزدُور، دھرتی کے کھیتوں کے بیٹے یہ ہالی
ہُوئے تاشقند و بخارا کے سُلطاں بنے کینٹن اور مکڈن کے والی

---

[۴] جارج آرول کی "اینی مل فارم"   [۵] کرامین کی مرتبہ "گاڈ دیٹ فیلڈ"

۴

ہمیں بھی ہوس تھی کہ آدرش کے محل ایسے بنائیں کہ ڈھائے نہ جائیں
سرِ عشق میں بے ستوں کوئی کاٹیں جنوں کو کسی نجد میں آزمائیں
کسی بحر میں سے کے نکلیں سفینہ تو پہنائے پاتال تک گھوم آئیں
وہ ہیروں کی وادی وہ مونگوں کے ٹاپو کہاں ہیں چلو ہمتیں آزمائیں
جو کنگال ہیں ان کو دھرتی کی دولت عنایت کریں مسندوں پر بٹھائیں
جو مزدور ہیں ان کو محنت کا حاصل جو دہقان ہیں ان کو کھیتی دلائیں
جو ناکام ہوں تو غزلخواں غزلخواں بڑھیں بہرِ پاداش بے خوف ہو کر
مریں تو مریں مثلِ گبریل پیریؔ[1]، جئیں تو جہاں میں دمتروفؔ[2] ہو کر

مگر دوستو دوستو دوستو! ہم جہاں سے چلے تھے ابھی تک وہیں ہیں
وہ آدرش کے محل تو ڈھا چکے، ان کے کھنڈرات میں غول بن کے مکیں ہیں
وہ پہلے سا وحشت کا عالم کہاں ہے ابھی سے یہ محسوس ہونے لگا ہے
افق سے افق تک بڑی منزلیں ہیں کراں سے کراں تک بڑا فاصلہ ہے

---

[1] فرانس کا ایک انقلابی جو نازیوں کے ہاتھوں شہید ہوا [2] مقدمہ آتش ریشتاغ کا ہیرو

بہت جی میں آتی ہے یاروں سے کہدیں ہمیں بھی پکارو، ہمیں بھی بلاؤ
مگر کالے کوسوں کی دشوار منزل کہے جا رہی ہے ابھی لوٹ جاؤ
گدائی میں ہم شہرِ کنعاں کے سنیوں کے محلوں کے دیوار و در چوم آئے
جو سچ پوچھو اس میں بڑی عافیت ہے مگر قلعۂ مصر کو کون ڈھائے؟

ہمیں گرد بن کر پسِ کارواں دھندلے دھندلے سے قدموں پہ جمتے رہیں گے
ہمیں راستے کے ہر اک موڑ پر اک نہ اک عذر پر یونہی تھمتے رہیں گے
مگر دور کی منزلوں کی یہ راہیں تو ویران اب تک ہوئی ہیں نہ ہوں گی
جری شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے انجان اب تک ہوئی ہیں نہ ہوں گی
سمجھتے ہیں ہم آنے والا زمانا تمہارا ہے لوگو ہمارا نہیں ہے
مگر اپنے پاؤں کہ تھک سے گئے — ان میں اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں ہے
یہی راستہ ہے رُکے تو گئے — رات لمبی ہو یا باٹ لمبی ہو جاؤ!
وہ پورب میں ممیاتی بھیڑوں کے گلّے کے باڑے کے پہلو میں دہکا الاؤ

کوجے ایک چھوٹا سا پتھریلا جزیرہ ہے، جنوبی کوریا کے ساحل پر جہاں امریکیوں نے شمالی کوریا کے جنگی قیدیوں کو رکھا تھا، ان میں بہت سے دست و پا بریدہ تھے۔ کیمپ کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔ قیدیوں کو ان کی حکومت کے خلاف ورغلایا جاتا تھا۔ بھوکا رکھا جاتا تھا اور ان کے جسموں پر زبردستی کمیونزم کے خلاف نعرے گود دے جاتے تھے۔ آخر ان لوگوں نے بانسوں، پتھروں اور بیساکھیوں کے بل پر بغاوت کر دی جس کا احوال مغربی اخباروں رسالوں میں چھپا۔ یہ نظم ان دنوں سویرا اور شاہراہ میں چھپی تھی لیکن چاند نگر کے پہلے ایڈیشنوں میں شامل نہ کی جا سکی تھی۔ یہ نظم اور ایک دوسری نظم "کوریا کی خبریں" کیونکہ اس زمانے کی ہماری حکومت کو اس قسم کا کلام گوارا نہ تھا۔

دریائے یالو کے پشتوں پر حملہ جہاں کوریا کو بجلی پہنچانے والے ہیڈ ورکس تھے اور قریہ سنچو کی تباہی بلکہ ناپیدی کوریا کی جنگ کے ان واقعات میں سے تھی جس نے ضمیرِ عالم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نئی نرسوں کے جلوس نکالنے کی تصویریں بھی دنیا بھر کے اخباروں میں چھپی تھیں۔

کوچے کی لڑائی

پھر کوچے میں گولی برسی، پھر کوچے میں جنگ ہوئی

پھر سرخوں نے سازش کرکے ہنسا کا پرچار کیا
گود میں آزادی کی ٹھمک کر آنے سے انکار کیا
اپنے باغی راگ الاپے، سرخ سرخ جھنڈے لہرائے
سارے بندی ایکا کرکے نکلے اور مِل کر چِلّائے
"ہم کو ہمارے حال پہ چھوڑو! اجنبیو اس دیس سے جاؤ
نگر نگر کو بندی خانہ، کھیت کھیت مرگھٹ نہ بناؤ"
ان کی باغی للکاروں سے وادی وادی گونج اٹھی!
پھر کوچے میں گولی برسی، پھر کوچے میں جنگ ہوئی

ہم نے انھیں کتنا سمجھایا روس کی چالیں ہیں کیا کیا
ہم لوگوں کو سات سمندر پار سے کیونکر آنا پڑا !
پر وہ ہماری انسانی ہمدردی کے قائل نہ ہوئے
جبری مزدوری سے بچ کر آنے پر مائل نہ ہوئے

آخر ہم ٹینکوں کے دستے، طیاروں کے بیڑے لائے
جمہوری توپوں سے دنادن گولے پھینکے، بم برسائے
سو دو سو وہیں ایک باڑھ میں ڈھیر ہوئے، کروٹ بھی نہ لی
جب کوچے میں گولی برسی، جب کوچے میں جنگ ہوئی

اس پر بھی سُرخوں کے ارادے باغی کے باغی ہی رہے
بلکہ اب تو سُرخ پھریرے اور بھی اونچے اڑنے لگے
باغیوں کے گیتوں کی تانیں شعلے سے برسانے لگے
شام و سحر اس کیمپ سے باہر گرم ہوائیں آنے لگیں
ان لوگوں کو گالی جھڑکی کھانا تک منظور نہ تھا
اپنے جسموں پر نعرے گدوانا تک منظور نہ تھا
خون ہمارا پھر کھول اٹھا — پھر سوئی غیرت جاگی!
پھر کوچے میں گولی برسی، پھر کوچے میں جنگ ہوئی

کہیں پتھر، کہیں بانس کی لاٹھی، کہیں چاقو تھا کہیں بھالا
ان لوگوں کے پاس لڑائی کا کیا کیا سامان نہ تھا
اسی عالم میں حملہ کرنے پلٹن کی پلٹن امڈی
امریکی جانوں کی ان کو ذرہ بھر پروا نہ ہوئی
ہم تنہا — اور پاس ہمارے یہی ٹینک یہی طیارے
اس پر بھی ہم لوگ نہ کچھ گھبرائے نہ کچھ ہمت ہارے
ایک طرف تھے کیمپ کے باسی ایک طرف ہم پردیسی
جب کوجے میں گولی برسی، جب کوجے میں جنگ ہوئی

کہنے کو اس کیمپ میں چھ سو لنگڑے اور اپاہج تھے
لڑنے میں پر یہی لوگ تھے دوسروں سے آگے آگے
گھٹنوں اور ہاتھوں پہ اچکتے بڑھتے تھے ظالم وحشی
ایک ایک کے ہاتھ میں تھی، لکڑی کی بھیانک بیساکھی
ہم لوگوں کے پاس تو جو ہتھیار تھے، ہم نے کہہ ہی دیا
اس پر بھی اس جنگ میں ہم لوگوں ہی کا پلّہ جھکا رہا
اسّی نوّے وہی مرے اور ایک ہمارا امریکی
جب کوجے میں گولی برسی، جب کوجے میں جنگ ہوئی

امن کا ساتھ ہمیشہ دیا ہے امن کا ساتھ سدا دیں گے
چاہے ہمیں اس امن کی خاطر تیسری جنگ بھی لڑنی پڑے
امن کی اور کسے خواہش ہے آزادی کی کس کو طلب
ایٹم بم، نیپام کے گولے جو مانگو تیار ہے سب
پہنچے گا ابھی ان کی بدولت دُور دُور تک امن کا نام
کوریا میں لڑنے والے امریکی جانبازوں کو سلام
تاریخوں میں نام رہے گا دنیا کبھی نہ بھولے گی!
کیوں کوجے میں گولی برسی، کیوں کوجے میں جنگ ہوئی

(۱۹۵۲)

○

کوریا کی خبریں

آج امریکہ کے بمباروں نے بمباری کی
بند یالو کا تبہ کر کے بالآخر چھوڑا
نیم شب گنجے اڈیٹر کو جماہی آئی!
ایک کالم میں کہیں ان کو بھی اس نے جوڑا
عیدِ مسعود کے پیغاموں کے تھوڑا نیچے
اور اسی شام کو اخبار وہ باسی بھی ہوا

اور یالو کے بڑے بند کی بجلی گاہیں!
ایک جھٹکے سے خرابے کے سوا کچھ نہ رہیں
کف اڑاتی ہوئی یکبار گی پیکیں موجیں
آہن و سنگ کی دیواریں جو تیورا کے گریں
اور اُس رات کہیں نور نہ تقسیم ہوا
کارخانوں کی وہ دیوزاد مشینیں نہ چلیں

اتنے برسوں نے انسان نے پتھر ڈھوئے
تب کہیں ساحلِ یالو کا یہ پشتہ اُبھرا
دُور کی رِل کے مچلتے ہوئے پہیے گھومے
دُور کے شہر کی شہراہ کا چہرہ چمکا
اور امریکہ کے بمباروں کی اک ٹکڑی نے
ایک ساعت میں اسے نیست و نابود کیا

اپنے اِس ملک سے وہ پیار ہے ہم کو کہ اِدھر
دوسرے ملک کا کوا بھی نہ آنے پائے
اور اِک دیس میں جب وحشی ہُنوں کے لشکر
موت کے تحفے غلامی کے سندیسے لائے
ہم نے ان لوگوں کی نُصرت کی دعائیں مانگیں
ہم نے اُن لوگوں کی عظمت کے قصیدے گائے

یاں نہ شعلوں کی تپک اور نہ توپوں کی تُلک
یالو دریا ہے بہت دُور بہت دور کہیں
پھر بھی اک بات ہے انسان سے حیوان تلک
جس کا اِس حال مشکل ہی سے آئے گا یقیں
اب کہ یالو کے بڑے بند کی بجلی گاہیں،
ایک جھلسے سے خرابے کے سوا کچھ بھی نہیں

۲

کوریا میں ہے لڑائی کی نئی سالگرہ
آج اِس جنگ کے آغاز کو دو سال ہوئے
پڑھنے والے نے کنکھیوں ہی سے اِس کو دیکھا
اور اخبار کے دو چار الٹ کر صفحے
"اب کے شہزادہ علی کس سے کریں گے شادی"
ایک مضمون کو پڑھنے لگا بے تابی سے

جیسے یہ سالگرہ عیدِ عزیزاں ہی تو ہو
جیسے کچھ دیر میں لاتے ہوں سجیلے مہماں
ایک ننھے سے حسیں چاند کی دل جوئی کو
نکہت و رنگ و لطافت میں بسے خوانِ گراں
شورِ تبریک میں تحفوں کے کھلیں گے دھاگے
اور ہر شے پہ مچل جائے گا وہ جانِ جہاں

اور یہ جشن یہی سالگرہ دُور کہیں
ایک وادی میں سے گزری ہے جو چپکے چپکے
کوئی صحرا کا چھلاوا کسی لاشے کے قریں
کس کے ہونٹوں کی حلاوت پہ پُرانے قصّے
ایک لمحے کو سناتے ہوئے رک جاتا ہے
اور کہتا ہے کہ اس بات کو دو سال ہوئے

دُور کے دیس سے آتے ہیں سجیلے مہماں
کوریا کے لئے تحفے میں کھلونے لے کر
یہ ہیں بمبار یہ نیلا سا ہے یو این کا نشاں
یہ رہے ٹینک یہ توپیں یہ حبیبا لشکر
یہ رہی موت یہ ویرانی یہ بندی خانے
تجھ سے کیا چیز ہے اے جانِ برادر بہتر

دشتِ ویراں میں کسی غولِ بیاباں کی طرح
قافلے کوریا والوں کے بھٹکتے نکلے
کون منزل ہے کہاں پہنچیں گے بھٹکے راہی
آپ کٹ جائیں گے اس راہ کے کٹتے کٹتے
درد کی رات ہے لمبی شبِ ہجراں کی طرح
جس میں مہتاب کی مشعل ہے نہ تاروں کے دیئے

۳

سطحِ کاغذ پہ سیاہی نے بچھی ہے افشاں
منگجے منگجے صفحوں پہ یہ بے جاں سی سطور
کتنی گودوں کے اُجڑنے کا بنی ہیں عنواں
کتنی مانگوں سے دھلاتی ہیں رسیلا سیندور
کتنے کھیتوں میں اُگاتی ہیں پُر آشوب دھواں
کتنے میدانوں میں قبروں کی قطاریں بھرپور

ریڈیو شام کا لاتا ہے شپا شپ خبریں
ہر نئی صبح چلا آتا ہے تازہ اخبار
آج تو گاؤں سنجو کا بھی یاد آیا زد میں
اب تو اک جھلسا خرابہ ہے وہ خستہ مسمار
آج نیپام نے جھلسا دی ہے کشتِ دہقاں
آج زندوں کے لیے کھودے ہیں زندوں نے مزار

بحثیں ہوتی ہیں بھرے کیفوں میں ایوانوں میں
کون اس جنگ میں مجرم ہے یہ کس کو معلوم
کون سے ملک کی سرحد ہے کہاں کیا جانیں
کوریا والے کہ امریکی ہیں اس میں مظلوم
کیوں عبث جی کے جلانے کو تم اخبار پڑھو
ایک ہم زندہ حقیقت ہیں، یہ باقی موہوم

زخمی بچوں کی کراہوں میں ترنم ہے نہ لوچ
ننگی نرسوں کی نگاہوں میں نہ رس ہے نہ مٹھاس
جھلسے کھیتوں کے نظارے سے تو چھپتی نہیں سورج
سونے شہروں نے تو پہنا ہے اداسی کا لباس
پھر وہ کچھ لوگ سجا نے چلے ایوانِ غزل
کوئی مضموں ہی نہیں شاعرِ مجبور کے پاس

آج یاآتو ہے تو کل اور بھی پُشتہ کوئی
اب سنبخو ہے تو کل اور بھی قریے ہونگے
آج پورب کے خرابوں میں ہے اترا کوئی
کل یہ کرگس سبھی اطراف میں پھیلے ہوں گے
آج کے روز جو یہ بات نہ سمجھے کوئی
آنے والے ہیں جو ایّام وہ کیسے ہوں گے؟

(۱۹۵۲ء)

طویل طویل انتظار کے بعد

انشا جی کا دوسرا مجموعہ

نظمیں ، غزلیں ، گیت

اُسی جوگ بجوگ کی روایت میں

اس بستی کے
اک کوچے میں

جس میں ان کا مقبول عام کلام شامل ہے

' کل چودھویں کی رات تھی - - - - - '

' انشا جی اٹھو اب کوچ کرو - - - - - '

' یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں '

' اک انشا نام کا دیوانہ '

' فرض کرو -

سب مایا ہے '

' دل اک کٹیا دشت کنارے ' وغیرہ

اور طویل نظمیں

' دیوار گریہ ' - یہ بچہ کس کا بچہ ہے -

۱۵/-
